Sharjeel Ahmed
تعلیم و تربیت
اپریل 1995ء

Sharjeel Ahmad Warsi
Date
No.

السّلامُ علیکمُ

اُمّید ہے آپ کی سِوّیوں والی عید میٹھی گزری ہوگی۔ ہماری میز پر آپ کے بھیجے ہوئے پیارے پیارے، خوب صورت عید کارڈوں کا ڈھیر لگا ہُوا ہے اور اِنہیں دیکھ دیکھ کر ہم باغ باغ ہوئے جا رہے ہیں۔ آپ کا بہُت بہُت شکریہ کہ آپ نے اِس خوشی کے موقع پر ہمیں یاد کیا۔

جیسا کہ آپ کو پتا ہے، مئی میں تعلیم و تربیت کا سال نامہ شائع ہوتا ہے۔ اِس خاص نمبر کے لیے ہم نے پوری تیّاری کرلی ہے اور اِن شاء اللہ یہ یکُم مئی سے پہلے مُلک کے تمام بُک اِسٹالوں پر پہنچ جائے گا۔

اِس رنگا رنگ سال نامے میں ہم نے اُن تمام ادیبوں اور شاعروں کو جمع کر دیا ہے جِن کی کہانیاں اور نظمیں آپ مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ اور ہاں، اِس میں آپ چچا چھکّن کو ایک نئے رُوپ میں دیکھیں گے۔

سال گِرہ نمبر کے صفحات 80 اور قیمت 15 روپے ہوگی۔ آج ہی اپنے عِلاقے کے نیوز ایجنٹ سے کہ کر اپنے لیے ایک کاپی محفوظ کروا لیجیے۔

اس شمارے میں

اداریہ		1
آئی بہار (نظم)	ضیغم حمیدی	2
چندا کی نگری (کہانی)	سلیم احمد صدیقی	3
گھر کا مالک (کہانی)	محمد یونس حسرت	8
دو بچے (نظم)	قتیل شفائی	14
ممبو (کہانی)	محیط اسماعیل	15
فساد مت کرو (درسِ قرآن)	ڈاکٹر عبدالرؤف	19
تین کہانیاں (سنہری چڑیا)	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	20
آپ جانتے ہیں؟	س۔ل	22
من موجی (کہانی)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	23
اچھی باتیں (نظم)	زاہد الحسن زاہد	28
بُرے کی دوستی (کہانی)	عفت گل اعزاز	29
میر کماں کا کمال (کہانی)	سراج نظامی	32
آئیے مسکرائیں (لطائف)		34
دوسرا رخ (کہانی)	محمد فاروق انجم	35
نواب صاحب کی دعوت (کہانی)	محمد ادریس قریشی	38
کون سی کشتی؟		41
آئیے دوست بنائیں		42
حکایات بوستان سعدی		43
باتیں بڑوں کی		44
داؤدی علمی آزمائش		46
آپ کا خط ملا		47
آپ بھی لکھیے		50
اللہ کی نعمت (نظم)	ضیاء الحسن ضیا	57
نیپال کے جنگل میں (کہانی)	سلیم خاں گمی	58
مجرم کون؟		64

55 واں سال
پہلا شمارہ
تعلیم و تربیت
...ان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
...بچوں کا محبوب رسالہ
...ایڈیٹر عبدالسلام
سعید لخت
...ٹ ایڈیٹرز: رضوان ثاقب
...نز ڈیزائننگ سید شوکت الاعجاز
...اسسٹنٹ محمد بشیر راہی
...فیروز سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ لاہور
ظہیر سلام
عبدالسلام
پتا
...ہنامہ تعلیم و تربیت
... شارع بن بادیس لاہور
...ن: 6361309-6361310
6278815-6278816
سرکولیشن اور اکاؤنٹس
... شاہراہ قائداعظم لاہور
سالانہ قیمت
...یں (صرف رجسٹری کے ساتھ) 250/- روپے
...افریقہ (ہوائی ڈاک سے) 475/- روپے
...(ہوائی ڈاک سے) 675/- روپے
...مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) 695/- روپے
...قیمت منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعے پیشگی ارسال کیجیے
اپریل
1995
قیمت فی پرچہ 12/- روپے
سرورق: چندا کی نگری

ضیغم حمیدی

آئی بہار

پھر گلشن میں آئی بہار   نئے نئے گُل کِھلے ہزار
فصلِ خزاں کا دور گیا   چلنے لگی مستانی ہوا
چمپا، چنبیلی اور گلاب   لگتے ہیں کتنے شاداب
سارے پرندے چہک اُٹھے   گُل خوش بو سے مہک اُٹھے
فاختہ، مینا اور طوطے   پھر اپنی بولی بولے
خوشبوؤں کا موسم ہے   یہ نغموں کا موسم ہے
کہتی ہے یہ بادِ صبا[1]   ہر سُو ہے سر سبز فضا
لمبی ہے پھولوں کی قطار   ہر شئے پر ہے خوب نکھار

(1) صبح کی ٹھنڈی ہوا جو مشرق کی طرف سے آتی ہے۔ پُروا۔

یوری کوتل
ترجمہ: سلیم احمد صدیقی

چندا کی نگری

"عثمان علی اوف" وسط ایشیا کی ایک مسلم ریاست 'اُزبکستان' کے دارُالحکومت تاش قند میں رہتا تھا۔ آج کل اُس کے اِسکول میں سردیوں کی چھٹیاں تھیں' اور وہ اپنے دادا جان کے پاس گاؤں میں آیا ہُوا تھا۔ دادا جان کا نام "جُمعہ بایوف" تھا اور وہ بھیڑیں پالتے تھے۔ عثمان گاؤں آکر بہت خوش ہُوا کیوں کہ یہاں کا ماحول بہت کھلا کھلا اور صاف سُتھرا تھا۔ وہ بھیڑوں کی رکھوالی اور دوسرے کام کاج میں دادا جان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ایک دن تو اُس نے ہمت کر کے شکاری کُتّوں کو کھانا بھی خود کِھلایا۔اُسے اِن کتّوں کی شکل دیکھ کر خوف آتا تھا' لیکن کتّے دو ہی دِن میں اُسے پہچاننے لگے تھے اور اب اُسے دیکھ کر بھونکتے نہیں تھے۔

ایک دن دادا جان اور عثمان نے گاؤں سے باہر پکنک منانے کا پروگرام بنایا۔ اُنھوں نے کچھ دُور جا کر ایک کھلی جگہ اپنا خیمہ لگایا اور اُس کے اندر سامان رکھ دیا۔ سارا دن سیر سپاٹا کرنے کے بعد رات کو دونوں آگ کے پاس بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک اُنھیں کچھ دُور آگ کا ایک چمک دار گولا نظر آیا جو زمین سے آسمان کی طرف جا رہا تھا۔

"ارے! عثمان! دیکھو' یہ کیا ہے"؟ دادا جان حیرت سے چلّائے۔

عثمان کے چہرے پر ذرا سی بھی حیرت نہ تھی۔ اُس نے بے پروائی سے کہا "کچھ نہیں' دادا جان۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اُس طرف ہمارا خلائی پروازوں کا مرکز بیکانور ہے۔ لگتا ہے کہ وہاں سے کوئی خلائی جہاز خلا میں چھوڑا گیا ہے"

اُوپر آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ یہ دُوسری یا تیسری تاریخ کا چاند تھا۔

"آج کل کے بچے بہت سمجھ دار ہیں۔ بڑوں سے زیادہ جانتے ہیں" دادا جان بڑبڑائے "اِنھیں کوئی چیز حیران نہیں کرتی۔ اچھا بچّو' ذرا یہ بتاؤ کہ یہ جو چاند نظر آرہا ہے' یہ نیا ہے یا پُرانا؟۔"

"لو، دادا جان" عثمان نے کہا "چاند بھی کہیں نیا اور پُرانا ہوتا ہے؟-- چاند تو بس چاند ہی ہوتا ہے"۔

"اُونہوں" دادا جان نے پوتے کو ہارتے دیکھا تو مسکرائے "دیکھا؟ نہ دے سکے ناں جواب؟ سُنو، بیٹے۔ اِس وقت چاند کی نوکیں بائیں جانب کو ہیں اور اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نیا چاند یعنی ہِلال ہے۔ 11، 12 دن بعد یہ پُورا ہو جائے گا، جسے ہم چودھویں کا چاند کہتے ہیں---اِس کے بعد یہ گھٹنا شروع ہو گا اور 24، 25 دن کے بعد اِس کی شکل ایسی ہی ہو جائے گی جیسی اب ہے۔ لیکن تب اِس کی نوکیں دائیں جانب کو ہوں گی اور ہم کہیں گے کہ یہ پُرانا چاند ہے اور اب یہ چُھپنے والا ہے"۔

"اوہو! چھوڑیں بھی، دادا جان "عثمان نے مُنہ بنا کر کہا" یہ نیا چاند اور پُرانا چاند تو پُرانی باتیں ہیں۔ آج کل چاند کی کیا اہمیت ہے؟ اِنسان نے چاند کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا ہے۔ وہاں گردو غُبار اور کنکر پتھر کے سِوا اور ہے کیا؟ کوئی بھی تو وہاں نہیں رہتا۔" دادا جان مسکرانے لگے۔

اب ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ عثمان اور دادا جان اپنے اپنے بستروں میں دبک گئے۔ خیمے کا دروازہ دادا جان پہلے ہی بند کر چکے تھے۔ جوں ہی عثمان کا جسم گرم ہُوا، اُس کی آنکھیں مُندنے لگیں۔ لیکن ابھی پوری بند نہ ہوئی تھیں کہ اچانک زمین زور سے ہِلی، جیسے اُس پر کوئی بہت بھاری شے آن گری ہو۔ اِس کے ساتھ ہی خیمے کے اندر بہُت تیز روشنی پھیل گئی۔ عثمان خوف زدہ ہو گیا۔ اُس نے چاہا کہ دادا جان کو پُکارے لیکن دہشت سے اُس کی آواز نہ نکلی۔ اُس کا جسم سُن ہو گیا تھا۔ اُس نے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا کہ کوئی خلائی مخلوق اندر آ گئی ہے۔ اُس نے بہُت چمک دار خلائی لباس پہنا ہُوا تھا۔

"تم عثمان ہی ہو ناں"؟ خلائی مخلوق نے باریک سی آواز میں کہا "تمھیں مُجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمھارا دُشمن نہیں، دوست ہوں"۔

"مگر... مگر آپ ہیں کون"؟ عثمان نے کہا "اور آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہُوا"؟

"میں چاند کی مخلوق ہوں۔ ہم چاند والے زمین والوں سے زیادہ عِلم رکھتے ہیں۔ مجھے زمین پر رہنے والے تمام لوگوں کے نام معلوم ہیں" اُس نے کہا۔

"مگر چاند پر تو کوئی بھی نہیں رہتا۔ یہ بات سب جانتے ہیں۔ امریکی خلاباز اور روسی خلائی جہاز وہاں جا چکے ہیں۔ اُنھوں نے وہاں سے آکر بتایا کہ چاند پر کوئی جان دار نہیں ہے۔ کیوں کہ وہاں نہ ہوا ہے نہ پانی"۔

"مگر ہم تو رہتے ہیں" خلائی مخلوق نے کہا "دیکھو، میں تمھارے سامنے کھڑا ہوں۔ تم چاہو تو مجھے چھُو کر دیکھ سکتے ہو۔ ویسے چاند کے بارے میں تم اور کیا جانتے ہو"؟

"میں چاند کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں" عثمان نے فخر سے سینہ تان کر کہا۔ اب وہ خوف زدہ نہیں تھا "چاند ہماری زمین کا سیّارہ ہے۔ وہ زمین کے گِرد گھومتا ہے اور چار ہفتوں میں اُس کے گِرد ایک چکّر لگاتا ہے۔ اُس کی سطح ہموار نہیں ہے۔ کہیں اُس پر پہاڑ ہیں، کہیں گھاٹیاں

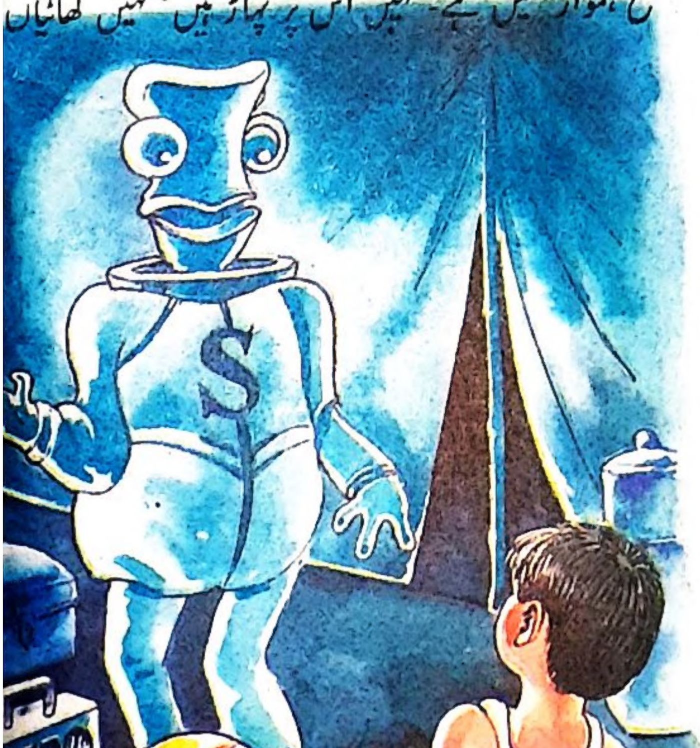

کہیں گہرے گہرے غار ہیں، کہیں دُھول سے اَٹے ہوئے میدان- وہاں نہ پانی ہے، نہ ہوا- اِس لیئے وہاں کوئی جان دار زندہ نہیں رہ سکتا-"

عثمان نے اپنے کورس کی کتاب میں لکھی ہوئی باتیں فرفر سُنانا شروع کر دیں-

"ٹھہرو! ٹھہرو!" خلائی مخلوق نے کہا "چاند کا ایک دن کتنا بڑا ہوتا ہے"؟

عثمان کی ساری شیخی دھری رہ گئی- اُس نے سر جُھکا کر کہا "یہ--- یہ--- یہ تو مجھے نہیں پتا-"

"تو سُنو" خلائی مخلوق نے کہا "میں بتاتا ہوں- چاند کا ایک دن تمہارے چودہ، پندرہ دن کے برابر ہوتا ہے- یوں سمجھو کہ تمہارا ایک مہینا اور ہمارا ایک دن ایک رات برابر ہوتے ہیں- ہاں، تمہیں ایک اور مزے کی بات بتاؤں"-

"کک--- کیا"؟ عثمان نے پُوچھا-

"تُم نے ایک بار سورج اور چاند کی تصویر بنائی تھی اور اُس کا نام رکھا تھا' غرُوب آفتاب سے پہلے کا ایک منظر--- وہ تصویر غلط تھی" خلائی مخلوق نے مسکراتے ہوئے کہا-

"کیوں"؟ عثمان نے پوچھا-

"وہ اِس لیئے کہ اگر غروب آفتاب سے پہلے سورج اور ہلال اکٹھے ہوں تو ہلال کے کونے دائیں جانب نہیں بلکہ بائیں جانب ہوتے ہیں- سورج چاند کے اپنے سامنے والے کناروں کو روشن کر سکتا ہے، دُور والوں کو نہیں"-

"دراصل" عثمان نے کھسیانا ہو کر کہا "ابھی اِسکول میں ہم نے اِتنا نہیں پڑھا"-

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے" خلائی مخلوق نے کہا "ابھی تمہیں یہ بھی پڑھنا ہے کہ چاند اور زمین کا درمیانی فاصلہ 385,000 (تین لاکھ پچاسی ہزار) کلو میٹر ہے، اور چاند کا رقبہ برِاعظم ایشیا سے بھی کم ہے- رہا چاند کا حجم، تو چاند زمین سے پچاس گُنا چھوٹا ہے- اِسی لیئے اُس کی کششِ ثقل بہُت کم ہے"-

"یہ تو مجھے پتا ہے" عثمان نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا "چاند کی کششِ ثقل زمین کی کششِ ثقل کا چھٹا حصّہ ہے- زمین پر جس چیز کا وزن سات کلو گرام ہے، چاند پر اُس کا وزن ایک کلو گرام ہو گا"-

"ہاں- تبھی تو تم لوگ ہمارے چاند پر آتے ہو تو اُچھل اُچھل کر چلتے ہو- تمہارے پیر چاند کی سطح پر ٹھیک سے نہیں ٹکتے-

"اِنسان مُدّتوں سے ہمارے چاند پر جانے کے خواب دیکھ رہا تھا- تمہارے کئی ادیبوں نے ایسی کتابیں لکھیں جن کے ہیرو کسی نہ کسی طرح چاند پر پہنچ گئے- اِس قسم کا پہلا ہیرو یونان کا اوڈی سس تھا- پھر آج سے تین سو سال پہلے ایک انگریز مُصنّف، فرانسس گولڈوِن، نے ایک کتاب لکھی- اِس

کتاب کے ہیرو نے ایک گاڑی میں بہت سارے بگلے جوتے اور اُنہیں اُڑا کر چاند پر پہنچ گیا۔ اور ہاں' فرانس کے رہنے والے ایک شخص سائرانو دی برجراک کے بارے میں تم نے کبھی کچھ سُنا ہے؟"

"نہیں" عثمان نے کہا "اُس نے کیا کیا تھا؟"

"وہ ایک اچھا بھلا سائنس دان تھا۔ اُس نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے' راکٹ آمنے سامنے چھ قطاروں میں رکھے ہوئے تھے اور وہ اِس طرح سلسلے وار جُڑے ہوئے تھے کہ ایک کے بعد دوسرا چلتا تھا' یہ کتاب چھپنے کے بہت دنوں بعد تمہارے سائنس دانوں نے کئی مرحلوں والے راکٹ بنائے اور اُن کی مدد سے زمین کے لوگ چاند پر گئے۔ اور ہاں' تم نے تو جرمنی کے ایک ادیب بیرن منچاذن کا نام بھی نہیں سُنا ہو گا؟"

"اُس نے کیا کیا تھا؟" عثمان نے حیرت سے پُوچھا۔

"اُس نے اپنی کہانیوں کے ہیرو کو دو بار چاند کا سفر کرایا تھا۔ اُس کی ایک کہانی کے ہیرو نے لوبیے کا ایک بیج بویا اور اُس میں سے اُگنے والے پودے پر چڑھتا چڑھتا چاند پر پہنچ گیا۔ اُس کی دوسری کہانی کے ہیرو کو تیز آندھی اُڑا کر چاند پر لے گئی تھی۔"

"میں سمجھ گیا" عثمان کی آنکھوں میں چمک لہرائی "آپ دراصل یہ بتا رہے ہیں کہ اِنسان کس کس طرح چاند پر جانے کے خواب دیکھتا رہا ہے"۔

"ہاں" خلائی مخلوق نے کہا "تم صحیح سمجھے۔ فرانس کے ایک اور ادیب جیولس ورنے کی ایک کتاب کا ہیرو ایک توپ میں گولے کی جگہ بیٹھا اور توپ کو چلا کر چاند پر جا پہنچا۔ آج تک تمہاری دُنیا کے مختلف ادیبوں نے کم از کم 30 بار لوگوں کو چاند پر بھیجا ہے۔ ہر بار اُنہوں نے زمین پر آ کر چاند کے بارے میں مختلف افسانے لوگوں کو سُنائے۔ لیکن یہ سب کہانیاں ہیں۔ اب میں کچھ سچّی باتیں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نے زمین سے چاند پر کس کس کو آتے دیکھا۔ 1959ء میں روس کے ایک خلائی جہاز نے چاند کے چاروں طرف چکّر لگائے اور اُس کی تصویریں اُتاریں۔ اِس جہاز نے چاند کی اُس دوسری سمت کی تصویریں بھی پہلی مرتبہ اُتاریں جو تم زمین والوں سے چھُپی رہتی ہے۔ اِس کے بعد 1966ء میں' پہلی بار ایک روسی خلائی جہاز چاند کی سطح پر اُترا۔ اِس کے تین سال بعد' 1969ء میں' کسی کہانی کا ہیرو نہیں بلکہ سچ مُچ کا ایک اِنسان پہلی بار چاند پر اُترا۔ یہ ایک امریکی تھا اور اُس کا نام تھا' نیل آرم سٹرانگ"۔

"یہ بات تو مجھے معلوم ہے۔ 1969ء میں نیل آرم

سٹرانگ چاند پر اُترا تھا" عثمان بولا۔

"1971ء میں روس کا ایک خلائی جہاز جس کا نام لونوخود اوّل تھا' چاند کی سطح پر اُترا اور کچھ دور چل پھر کر اُس کی تصویریں اُتاریں"۔

"آپ نے اِن سب کو چاند پر اُترتے دیکھا تھا"؟ عثمان نے سوال کیا۔

"ہاں بھئ' بالکُل دیکھا تھا" خلائی مخلوق نے کہا۔

"لیکن آرم سٹرانگ نے واپس زمین پر آکر آپ سے مُلاقات کا حال ہمیں کیوں نہیں بتایا؟ اور ہاں' آپ لوگ ہوا کے بغیر کیسے زندہ رہتے ہیں"؟

"ابھی بتاتا ہوں" خلائی مخلوق نے کہا "پہلے تم مجھے ایک سوال کا جواب بتاؤ"۔

"پُوچھیے" عثمان نے کہا۔

"کہتے ہیں کہ پہلے پہل چاند اور زمین دونوں کھولتا ہُوا سیّال یعنی مائع تھے اور چاند زمین ہی کا ایک حصّہ تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا چاند زمین سے ٹوٹ کر الگ ہو گیا؟ یا یہ دونوں ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے؟ یا چاند خلا میں آوارگردی کرتا ہُوا زمین کے پاس سے گزرا تو زمین کی کششِ ثقل نے اُسے پکڑ کر اپنا سیّارہ بنالیا"؟ خلائی مخلوق نے پُوچھا۔

"یہ--- یہ--- یہ تو بڑا مشکل سوال ہے" عثمان نے کہا۔

"اِس سوال کا جواب تُمہارا کوئی بڑے سے بڑا سائنس دان بھی نہیں دے سکا ہے" خلائی مخلوق نے کہا "تم ایسا کرو کہ میرے ساتھ چاند پر چلو اور وہاں کی لائبریری میں اِس سوال کا جواب ڈھونڈو۔ اگر تم نے اِس سوال کا جواب پالیا تو تم پہلے اِنسان ہو گے جس نے یہ مُعمّا حل کیا ہوگا"۔

"میں تیاّر ہُوں۔ چلیے" عثمان نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئ' اب اُٹھ بھی بیٹھو" دادا جان نے اُس کا بڑھا ہُوا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "صبح ہو گئی ہے۔ چاند پر پھر کبھی چلے جانا۔ تمہیں پتا ہے کل تمہارا اِسکول کُھل رہا ہے۔ اب ناشتے کے بعد ہم پہلے گاؤں چلیں گے اور پھر تمہارے گھر' تاش قند"۔

عثمان اُٹھ تو بیٹھا لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ چاند کا وہ شخص دادا جان میں کیسے تبدیل ہو گیا!

اگر آپ کی سمجھ میں آگیا ہو تو ہمیں بھی بتایئے گا۔

گھر کا مالک

محمد یونس حسرت

"خاور بیٹا' یہ کیا بات ہے؟" طاہرہ خانم نے رُقعہ پڑھتے پڑھتے نظریں اُٹھا کر خاور کی طرف دیکھا۔

بسکٹ خاور کے ہاتھ سے چھوٹ کر چائے کے کپ میں جا گرا اور وہ خاموشی سے اُسے کپ کی تہ میں جاتے دیکھتا رہا۔ اپنی ماں کے اِس سوال کی اُسے پہلے سے توقع تھی۔ اُس نے اِسکول سے گھر واپس آتے ہوئے ماسٹر صاحب کے رُقعے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ایک نہیں کئی ترکیبیں سوچی تھیں۔ وہ اِس رُقعے کو بس کی سیٹ کے نیچے ٹھونس سکتا تھا وہ اِس کو پھاڑ کر اور پُرزے پُرزے کر کے کوڑے کرکٹ کی ٹوکری میں پھینک سکتا تھا۔ یہ رُقعہ اُس کی جیب سے اِتفاقی طور پر گر بھی سکتا تھا۔ بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ کاغذ کے اِس پُرزے کو گم یا ضائع کر دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر اُس کے ذہن نے جتنی ترکیبیں سوچی تھیں، اُس نے اُن میں سے کسی پر عمل نہیں کیا تھا اور آخر کار گھر آ کر اُس نے اپنی جماعت کے اِنچارج ماسٹر صاحب کا رُقعہ اپنی ماں کے حوالے کر دیا تھا۔

"تمہارے ماسٹر صاحب نے لکھا ہے کہ تمہاری توجّہ پڑھنے لکھنے کی طرف نہیں ہوتی۔ تم کلاس میں بیٹھتے ہو مگر تمہارا دھیان کہیں اور ہوتا ہے۔ تم کلاس میں جمائیاں لیتے رہتے ہو اور کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے سو بھی جاتے ہو"۔

جب خاور نے کوئی جواب نہ دیا تو طاہرہ خانم کسی قدر تیز لہجے میں کہنے لگیں "یہ کیا بات ہے؟ کیا تم رات کو دیر تک ٹی وی دیکھتے رہتے ہو"؟ خاور نے نفی میں سر ہلایا

"اچھی بات ہے" طاہرہ خانم نے کہا "اگر رات کو دیر تک ٹی وی دیکھو گے تو میں اِس ٹی وی کو وہیں واپس بھجوا دوں گی جہاں سے یہ آیا ہے"۔

"نہ امّی نہ" خاور نے ایک دم چیخ کر کہا۔

وہ اور اُس کے ابّو گراج کے برابر والے کمرے میں بیٹھ کر ٹیلی وژن پر کھیلوں کے پروگرام دیکھا کرتے تھے۔ اِس کمرے کو اُس کے ابّو اپنے گھریلو دفتر کے طور بھی اِستعمال کرتے تھے اور خاور سے کہا کرتے تھے "بس ہم

دونوں مرد!"

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، امّی" خاور نے کہا اور یہ کہتے ہوئے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ اُسے ڈر تھا کہ اُس کی امّی نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھ لیا تو وہ جان جائیں گی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ امّی ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ وہ اُس کا چہرہ دیکھ کر بتا سکتی ہیں کہ وہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔ وہ بات بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا:

"میرا خیال ہے مجھے تھکاوٹ یا کوئی اور بات ہو گئی ہے۔"

اچھا!" طاہرہ خانم نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ کہنے لگیں "مجھے معلوم ہے کہ اپنے ابّو کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد تم دونوں بہن بھائی کیا کچھ محسوس کرتے ہو گے۔ تم ابھی بچّے ہو اور نادیہ تو تم سے بھی دو ڈھائی سال چھوٹی ہے۔ میں ہر طرح تمھارے آرام کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ مگر باپ پھر باپ ہوتا ہے۔ ماں ہزار کوشش کرے، پھر بھی ماں ہی رہتی ہے۔ وہ باپ کی کمی پوری نہیں کر سکتی"۔

طاہرہ خانم شاید نہ جانے اور کیا کچھ کہتیں کہ خاور نے کتابیں اُٹھائیں اور اپنے کمرے میں جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے۔ اِس پر طاہرہ خانم نے چونک کر کہا "ایک منٹ، خاور بیٹا" خاور کے بڑھتے ہوئے قدم وہیں رُک گئے۔

"تم نے وہ ٹارچ تو نہیں دیکھی کہیں"؟ طاہرہ خانم نے سرسری انداز میں پوچھا "میرا خیال ہے، خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ میں نے اِس دراز میں رکھی تھی"۔

"کون سی ٹارچ"؟ خاور نے گھبرا کر پوچھا۔

"خیر کوئی بات نہیں" طاہرہ خانم نے بے پروائی کے انداز میں کہا "وہ یہیں کہیں پڑی ہو گی۔ گھر میں اکثر چیزیں اِدھر اُدھر ہوتی رہتی ہیں۔ بھلا کوئی کس کس چیز کا دھیان رکھے۔ مل جائے گی کہیں نہ کہیں سے۔"

"نہیں ملے گی، بالکل نہیں ملے گی" سیڑھیاں چڑھتے ہوئے خاور نے اپنے دل میں کہا۔ اُس کا یہ خیال بلا وجہ نہ تھا۔ اُس نے دن میں ٹارچ دراز سے نکال کر اپنے کمرے میں چھپا دی تھی۔ وہ رات کو اِسے اِستعمال کرتا تھا تاکہ اپنے مرحوم ابّو کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا کر سکے۔ اِس وعدے کا علم کسی کو نہ تھا۔ صرف وہ اور اُس کے ابّو ہی اِس سے واقف تھے۔ ابّو نے مرنے سے پہلے اُس سے کہا تھا:

"یاد رکھنا، بیٹے۔ یہ بات صرف ہم دونوں مردوں کے درمیان ہی رہے"۔

خاور اور نادیہ کے ابّو کی وفات کے بعد جب کہ گھر میں طاہرہ خانم، خاور، نادیہ رہ گئے تھے، طاہرہ خانم خاور کے کمرے میں اُسے شب خیر کہنے آئی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر اُس کے پاس بیٹھ کر اُس سے باتیں کرتی رہی تھیں۔ پھر اُنھوں نے خاور کا سر سہلاتے ہوئے پوچھا تھا "تم ٹھیک تو ہو، بیٹا؟"

"بالکل ٹھیک ہوں، امّی" خاور نے جواب دیا تھا اور پھر اس نے پوچھا تھا "امّی، آپ نے نیچے دروازے میں تالا لگا دیا ہے؟"

طاہرہ خانم کو خاور سے اِس سوال کی اُمید نہ تھی، مگر اُنھوں نے اُٹھتے ہوئے کہا تھا "ابھی نہیں۔"

پھر وہ خاور کو شب خیر کہہ کر چلی گئی تھیں۔ امّی کے جانے کے بعد خاور نے لحاف اُتار کر ایک طرف ڈال دیا تھا اور سونے کی بجائے جاگ کر وقت گزرنے کا اِنتظار کرتا رہا تھا۔ اُسے یاد تھا کہ اُس کی امّی بستر پر لیٹ کر کوئی کتاب یا رسالہ پڑھنے کی عادی ہیں۔ اِس لیے اُس نے گیارہ بجنے کا اِنتظار کیا تھا۔

گیارہ بجنے کے بعد وہ بستر سے نکلا اور اپنے کمرے سے باہر آکر سیڑھیاں اُترنے لگا تو اُس پر خاصی گھبراہٹ طاری تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اُس کی امّی نے اُس کے پیروں کی آہٹ سُن لی تو کیا ہو گا؟ کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر دبے

پاؤں چلنا اُس کے لیے ایک خاصا مُشکل کام تھا اور وہ بھی اندھیرے میں- اِس سے پہلے اُس نے کبھی آدھی رات کے وقت اُٹھ کر اکیلے گھر میں چکّر لگانے کی بات سوچی تک نہ تھی-

اندھیرے میں دبے پاؤں چلتے ہوئے وہ پہلے نیچے مکان کے بڑے دروازے پر گیا- دروازہ بند تھا اور اُس میں تالا بھی لگا ہوا تھا- اِس سے اُسے اِطمینان ہوا- اب وہ باورچی خانے کی طرف آیا- باورچی خانے کا دروازہ تھا تو بند مگر اُس کی کُنڈی نہیں لگی تھی- اُس نے دروازے کی کنڈی لگا دی اور یہ سوچتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف واپس مُڑا کہ اِس کام کے لیے ٹارچ سے مدد لینا مُناسِب ہو گا- اندھیرے میں ٹھوکر لگ سکتی ہے-

اِس کے بعد وہ روز رات کو ٹارچ لے کر گھر کے تمام دروازے دیکھ کر یہ اِطمینان کرتا تھا کہ ہر دروازہ مضبوطی سے بند ہے یا نہیں گئی اِس طرح اُسے کئی ایسی باتیں معلوم ہو گئی تھیں جو پہلے اُس کے عِلم میں نہیں آسکتی تھیں- مثلاً اُسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ چاند کی چاندنی جب شیشوں میں سے اندر آتی ہے تو اُس سے فرش پر عجیب عجیب سی شکلیں بنتی ہیں- اُسے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ چھت پر اُچھلتی کُودتی پھُدکتی ہوئی گلہریوں کے شور سے خاصی خوف ناک آواز پیدا ہوتی ہے- اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ڈرائنگ روم میں لگے ہوئے کلاک کی ٹِک ٹِک جو دن میں مشکل سے سُنائی دیتی ہے، رات کے وقت خاصی بلند ہو جاتی ہے- اُسے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ جب تیز ہوا چلتی ہے تو درخت کی شاخیں گھر کی دیوار سے ٹکراتی ہیں جس سے ڈراؤنی آوازیں پیدا ہوتی ہیں اور جنہیں سُن کر خود اُس کے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی ہے-

رات کے سنّاٹے میں اُسے کہیں دور سے پولیس کے سائرن کی آواز بھی سُنائی دیتی تھی جو اُسے اچھی لگتی تھی- کئی بار اُس نے دروازے کے باہر کسی کے قدموں کی چاپ بھی سُنی تھی، مگر اُسے اپنا وہم سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا تھا- کئی بار اُس نے اپنی امّی کے کمرے سے رونے کی آوازیں سُنی تھیں- اُنہیں سُن کر اُسے اپنے ابّو یاد آجاتے تھے اور خود اُس کا جی چیخ چیخ کر رونے کو چاہتا تھا- ایسے میں وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوری کوشش کرتا تھا مگر کوشش کے باوجود اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے-

گھر کی دیکھ بھال کرتے ہوئے اُسے دو ماہ ہو گئے تھے- وہ کوشش کرتا کہ اِسکول میں اُسے جماہی یا نیند نہ آئے، مگر رات کو دیر تک جاگنے کی وجہ سے اُسے لمبی لمبی جماہیاں آتی تھیں اور وہ کلاس میں بار بار اُونگھنے لگتا تھا-

اُسے معلوم تھا کہ اُس کے ماسٹر صاحِب کی نگاہیں بار بار اُس کی طرف اُٹھتی ہیں اور اب اُنھوں نے اُس کی امّی کے نام رُقعہ بھیجا تھا کہ اُن کا بیٹا کلاس میں اُونگھتا رہتا ہے اور اُس کا دِھیان سَبَق کی طرف نہیں ہوتا-

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے کتابیں ایک طرف رکھیں اور پھر حساب کا وہ کام کرنے بیٹھ گیا جو ماسٹر صاحِب نے اُسے دیا تھا-

اگلی صبح اُس کی امّی نے ماسٹر صاحِب کے رُقعے کے بارے میں کوئی بات نہ کی اور نہ یہ پُوچھا کہ اُسے کلاس میں نیند کیوں آتی ہے، مگر وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ اِس وقت نہ سہی پھر کسی وقت اِس بارے میں بات ضرور کریں گی-

اگلی رات جب اُس کی امّی کے کمرے کی بتّی دس بجے ہی بُجھ گئی تو وہ گیارہ بجے سے پہلے ہی ٹارچ لے کر اپنے کمرے سے نکل آیا-

ٹارچ جلا کر وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آیا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اُس کی امّی ساری روشنیاں گُل کرنا بھول گئی ہیں- اِس وقت اُسے خیال آیا کہ اُس کا یہ دیکھ بھال کرنے کا کام کتنا اہم ہے-

ڈرائنگ روم میں روشنی تھی- وہ روشنی گُل کرنے کے اِرادے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو دروازے ہی میں ٹھٹک کر رہ گیا- اندر اُس کی امّی بیٹھی تھیں- یہ بات

اِتنی اچانک اور اُمّید کے خلاف تھی کہ ٹارچ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جاگری۔ وہ اُسے اُٹھانے کے لیے جُھکا تو اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور اُس کے کانوں کی لَویں جلنے لگی تھیں۔

"اوہو!" طاہرہ خانم نے کہا "اب مجھے پتا چلا کہ ٹارچ کدھر چلی گئی تھی"۔

خاور نے جیسے اپنی امّی کی بات کی تائید کرتے ہوئے سرہلا دیا اور ٹارچ اُن کی طرف بڑھا دی۔

اُس کا خیال تھا کہ اب اُس کی امّی یہ ٹارچ دراز میں رکھنے کی بجائے الماری میں رکھ کر تالا لگا دیں گی۔ اُنہوں نے خاور اور نادِیہ کو سِکھایا تھا کہ اُنہیں کوئی چیز بھی اُن کی اِجازت کے بغیر لینی نہیں چاہیے۔

طاہرہ خانم نے ٹارچ خاور کے ہاتھ سے لے لی اور خاصی دیر تک خاموش رہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہیں یا جو کچھ سوچ رہی ہیں اُسے زبان پر لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ خاصی دیر کی خاموشی کے بعد اُنہوں نے کہا:

"تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے پڑوسی امجد میاں کا بڑا لڑکا راشد اپنے کام سے خاصی رات گئے واپس آتا ہے"؟

"جی' امی" خاور نے جواب دیا۔ اُس کی نظریں فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ اُسے معلوم تھا کہ امجد میاں جو خیر سے اُن کے پڑوسی ہیں' ایک میڈیکل اِسٹور چلاتے ہیں اور یہ میڈیکل اِسٹور تقریباً آدھی رات تک کُھلا رہتا ہے۔ امجد میاں کا بڑا لڑکا راشد اُن کے ساتھ میڈیکل اِسٹور میں کام کرتا ہے اور خاصی رات گئے گھر واپس آتا ہے۔

"تو بات یہ ہے امّی کے بیٹے' کہ تقریباً ہر رات جب راشد رات گئے اپنے کام سے واپس آتا ہے تو وہ یہ دیکھتا

ہے کہ کوئی شخص ٹارچ لیے ہمارے گھر میں چل پھر رہا ہے" امّی نے کہا۔

خاور اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اُسے اپنی امّی کی اِس بات کے جواب میں کچھ نہ کچھ ضرور کہنا ہے مگر اُس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔

"اور پھر کئی بار تو وہ حیرت کے مارے ہمارے دروازے تک بھی آیا اور اُس نے دروازے کی درزوں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ سُن رہے ہو، خاور"؟ اُنھوں نے پُوچھا۔

خاور نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ اُسے راشد پر غصّہ آرہا تھا۔ وہ دوسروں کے گھروں میں تاک جھانک کیوں کرتا ہے؟

"پتا نہیں اُس نے میرے ساتھ بات کیوں نہیں کی۔ شاید اُسے یہ خیال آیا ہو گا کہ کہیں میں بُرا نہ مان جاؤں یا شاید اُس نے سوچا ہو گا کہ ایسا نہ ہو کہ جو کچھ اُس نے دیکھا وہ اُس کا وہم ہو اور اُسے شرمندگی اُٹھانی پڑے۔ کچھ بھی ہو اُس نے میرے ساتھ تو بات نہیں کی مگر اپنی ماں کو ساری بات ضرور بتا دی، اور اُس کی ماں نے آج مجھے بتایا۔ اب میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم رات کے وقت یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو"؟ امّی نے ذرا سختی سے کہا۔

طاہرہ خانم کی آواز میں نہ جانے کیا بات تھی کہ خاور کی فرش پر گڑی ہوئی نظریں خودبخود اُن کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ گڑبڑا سا گیا۔ اُس کی امّی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ رو رہی تھیں۔ اِس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اُنھوں نے اپنے بچّوں کے سامنے کبھی اپنے دُکھ کا اِظہار نہیں کیا تھا اور اپنے آپ کو سنبھالے رکھا تھا۔ مگر اِس وقت اُن کا بیٹا خاور اُن کے سامنے تھا اور وہ رو رہی تھیں۔

"ابّو نے مجھے ایسا کرنے کو کہا تھا" خاور کے مُنہ سے بے اِختیار نکلا۔

"کیا؟" طاہرہ خانم نے چونک کر کہا اور پھر وہ کُرسی سے اُٹھتے ہوئے کہنے لگیں "کیا کہا تھا اُنھوں نے؟ ٹھیک ٹھیک بتاؤ، خاور!"

جس انداز سے طاہرہ خانم نے اپنے بیٹے کا نام لیا تھا اُس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ نہ صرف اپنی بات کا ٹھیک ٹھیک جواب سُننا چاہتی ہیں بلکہ یہ جواب اُنھی الفاظ میں سُننا چاہتی ہیں جو خاور سے اُس کے ابّو نے کہے تھے۔ خاور نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر کہنے لگا:

"ابّو نے کہا تھا کہ اب تمھیں امّی اور اپنی بہن کی دیکھ بھال کرنی ہو گی۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں یہ بات اِس لیے کہہ رہا ہوں کہ اب اِس گھر کے مالک صرف تم ہو۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ بات کسی اور کو نہ بتانا۔ اِسے ہم دونوں مردوں کے درمیان ہی رہنا چاہیے"۔

یہ الفاظ ابھی خاور کی زبان سے پوری طرح نہ نکلے تھے کہ طاہرہ خانم ایک دم آگے بڑھیں اور خاور کو سینے سے لگا کر اُس کا ماتھا چومنے لگیں۔ اُس وقت وہ رو بھی رہی تھیں اور ہنس بھی رہی تھیں۔

امّی کی یہ حالت دیکھ کر خاور گھبرا گیا۔ کہنے لگا "امّی! امّی! یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے، امّی"؟

"کچھ نہیں ہوا" طاہرہ خانم نے اور جوش سے خاور کو اپنے سینے سے لپٹاتے ہوئے کہا "مجھے افسوس صرف اِس بات کا ہے کہ مجھے اِس بات کی خبر نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ تمھارے ابّو کو اس بات کا بالکل اندازہ نہ تھا کہ تم اُن کی بات کا غلط مطلب سمجھو گے اور وہ کچھ کرو گے جو وہ نہیں چاہتے تھے، اور وہ کچھ نہیں کرو گے جو وہ چاہتے تھے"۔

خاور حیران حیران سا اپنی امّی کی طرف دیکھنے لگا۔ اُن کی بات اُس کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی۔ امّی نے اُس کی حیرانی بھانپ لی۔ وہ کہنے لگیں:

"سُنو، خاور! تمھارے ابّو نے جو کچھ تم سے کہا اُس کا مطلب وہ نہیں تھا جو تم نے سمجھا۔ اُن کا مطلب تو یہ تھا کہ

تم ایک اچھا لڑکا بننے کی کوشش کرو گے۔ نادیہ کا ایک قابلِ فخر بڑا بھائی بنو گے اور گھر کے کاموں میں اپنی امّی کا اِس طرح ہاتھ بٹایا کرو گے کہ اُنھیں اپنے شوہر کی کمی محسوس نہ ہو۔ اُنھیں یہ اِحساس ہو کہ اُن کے بیٹے کی صورت میں گھر کے اندر ایک مرد موجود ہے جسے اِس گھر کا مالک کہا جا سکتا ہے، اور جو اپنی کم عُمری کے باوجود اپنی ماں اور اپنی چھوٹی بہن کا خیال رکھتا ہے۔ ماں اور چھوٹی بہن کی دیکھ بھال سے اُن کا یہی مطلب تھا۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ تم آدھی رات کو اُٹھ اُٹھ کر یہ دیکھتے پھرو کہ کوئی دروازہ کُھلا تو نہیں رہ گیا، کسی کمرے کی بتّی تو جلتی نہیں رہ گئی"۔

اب امّی کی باتیں اُس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ اُنھوں نے اُسے مزید سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تمھارے ابّو نے جب تمھیں اِس گھر کا مالک کہا تھا تو تمھیں تمھاری ذمّے داریوں کا اِحساس دلایا تھا۔ وہ اکثر مُحاورے کی زبان میں بات کیا کرتے تھے اور مُحاورے کی زبان کا ظاہری مطلب کچھ اور ہوتا ہے اور اصل مطلب کچھ اور۔ جیسے کسی کے حیران ہونے پر کہتے ہیں کہ اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اِس کا مطلب یہ تھوڑی ہوتا ہے کہ اُس نے اپنے ہاتھوں میں طوطے تھام رکھے تھے جو اُڑ گئے"۔

خاور نے بات سمجھنے کے انداز میں سرہلایا تو ساتھ ہی ایک لمبی سی جماہی اُس کے مُنہ سے نکلی اور اُس کا مُنہ غار کے مُنہ کی طرح کُھل گیا۔

"اوہو"! طاہرہ خانم نے مسکراتے ہوئے کہا "تمھیں تو بڑے زوروں کی نیند آرہی ہے۔ اچھا، باقی باتیں کل کریں گے"۔

اِس کے بعد خاور کو صِرف اِتنا یاد تھا کہ اُس کی امّی اُسے بستر پر لِٹا کر لحاف اُڑھا رہی تھیں۔ نیند سے بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے اُس نے صِرف اِتنا دیکھا کہ امّی نے ٹارچ دوبارہ اُس کی میز پر رکھ دی ہے۔ ٹارچ میز پر رکھتے ہوئے اُنھوں نے اُس کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اب اِس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

نپولین اور کسان

ایک دِن فرانس کا بادشاہ، نپولیَن، شکار کھیلتے کھیلتے ایک گاؤں میں جا نکلا۔ اُس نے ایک کھیت میں ایک بوڑھے کسان کو کام کرتے دیکھا تو اُس سے پُوچھا "بابا، لوگ اپنے بادشاہ سے خوش ہیں یا ناخوش؟"

کسان بولا "لوگ بادشاہ سے بہُت خوش ہیں اور اُس کی تعریف کرتے ہیں۔ مجھے بڑی مُدّت سے اُسے دیکھنے کی خواہش ہے"۔

نپولیَن نے کہا "تمھاری یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ بادشاہ سلامت نے یہاں سے تھوڑی دُور اپنے سرداروں کے ساتھ پڑاؤ ڈالا ہے"۔

راستے میں کسان نے پُوچھا "وہاں تو بہُت سے لوگ ہوں گے۔ میں بادشاہ کو کیسے پہچانوں گا؟"

نپولیَن بولا "بادشاہ کو دیکھ کر سب لوگ اپنی ٹوپیاں اُتار لیں گے اور اُسے جُھک جُھک کر سلام کریں گے"۔

جب نپولیَن اور کسان پڑاؤ پر پہنچے تو سرداروں نے اپنی ٹوپیاں اُتار کر بغل میں دبالیں اور نپولیَن کو جُھک جُھک کر سلام کرنے لگے۔ نپولیَن نے کسان سے پُوچھا "کیوں بابا، بادشاہ کو پہچانا؟"

کسان بولا "جناب، آپ بھی ٹوپی پہنے ہوئے ہیں اور میں بھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ بادشاہ ہیں یا میں"۔ نپولین ہنس پڑا اور کسان کو اِنعام دے کر رُخصت کیا۔

جو بچّے

قتیل شِفائی

جو بچّے ماں باپ کی خِدمت کرتے ہیں
اُن کے لِیے رحمت کے پھول بِکھرتے ہیں
باپ کے سائے میں رحمت ہے
ماں کے قدموں میں جنّت ہے
اُن کے سر پر ہاتھ فرشتے دھرتے ہیں
جو بچّے ماں باپ کی خِدمت کرتے ہیں

دِل ماں باپ کا جِس نے دُکھایا
اُس نے کبھی آرام نہ پایا
صِرف اُنہی کے بِگڑے کام سنْورتے ہیں
جو بچّے ماں باپ کی خِدمت کرتے ہیں

بنتی ہے بُنیاد جہاں کی
باپ کی شفقت، لوری ماں کی
خوشیوں سے وہ اپنی جھولی بھرتے ہیں
جو بچّے ماں باپ کی خِدمت کرتے ہیں

بھولو

محیط اسماعیل

گلی کے لڑکوں میں شعیب سب سے چھوٹا تھا۔ اس کی بہن اُس سے بھی چھوٹی تھی، جس کے ساتھ وہ زیادہ نہیں کھیل سکتا تھا۔ زیادہ کھیلنے کو جی کرتا تو گلی میں نکل جاتا اور وہاں کھیلتے ہوئے لڑکوں میں شامل ہو جاتا۔ کبھی لڑکے آپ ہی گلی میں جمع ہو جاتے اور کبھی کوئی لڑکا دوسرے لڑکوں کو بُلانے کے لیے اُونچی آواز میں گانے لگتا :

آؤ بچّو، کھیلیں کُودیں — آنکھ مچولی، ڈنڈا ڈولی
دوڑو بھاگو، گھر سے نکلو — دیکھو، جمع ہوئے ہم جولی

جس بچّے کے کان میں یہ آواز پہنچتی، وہ دوڑا چلا آتا، اور پھر گلی میں ایسا شور مچتا کہ کوّوں کا مُشاعَرہ بھی اُس کے سامنے ہیچ معلوم ہوتا۔ پہلے کھیل میں حصّہ لینے والوں کی گنتی ہوتی، پھر اُنھیں دو برابر حصّوں میں تقسیم کیا جاتا اور اِس کے بعد کوئی کھیل شروع ہو جاتا۔ شُعیب بھی بڑے شوق سے اِن کھیلوں میں حصّہ لیتا مگر بڑے لڑکوں کی پُھرتی کا ساتھ نہ دے سکتا، اِس لیے اکثر اُن کی جِھڑکیاں کھاتا اور کھیل میں سے نکال دیا جاتا۔ محلّے میں کوئی لڑکا اُس کا ہم عمر نہ تھا۔ یہ کمی اُسے بُری طرح محسوس ہوتی تھی۔

ایک دن شُعیب کو اِسکول جاتے ہوئے گلی میں ایک چھوٹا سا کُتّا نظر آیا، جو بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر اُس کو بہت ترس آیا۔ شاید اِس لیے کہ وہ خود بھی اکیلے پن کا شکار تھا۔ اُس نے اپنے بستے میں سے کھانے کا ڈبّا نکالا اور اُس میں سے ڈبل روٹی کا ایک سلائس نکال کر کتّے کے آگے ڈال دیا۔

کُتّے نے دُم ہلا کر اُس کا شکریہ ادا کیا اور سلائس چٹ کر گیا۔ اِس کے بعد وہ شعیب کے جوتے سُونگھنے لگا۔ شعیب نے پیچھے ہٹ کر ایک اور سلائس اُس کی طرف پھینک دیا۔ کتّے نے وہ بھی کھا لیا اور شعیب کی بوباس ذہن میں بسا لی۔ پہلی مرتبہ کسی نے اُس سے ہمدردی کا برتاؤ کیا تھا۔

اِتنے میں شعیب کے ابّو گھر سے نکلے اور انھوں نے شعیب کو اِسکول نہ جانے پر ڈانٹا۔ اِسکول گھر کے قریب ہی تھا اور وہ تین چار مِنٹ میں وہاں پہنچ جاتا تھا۔

اُس نے جلدی سے ڈبّا بند کر کے بستے میں رکھا اور اِسکول کی طرف چل دیا۔ کتّا اُس کے پیچھے دو چار قدم ہی چلا

تھا کہ وہ تیزی سے گلی میں مُڑ گیا۔ آدھی چھٹّی میں جب اُس نے کھانے کا ڈبّا نکالا تو اُسے وہ کتّا یاد آگیا۔ ڈبّے میں ڈبل روٹی کے دو سلائس تھے۔ اُس نے ایک سلائس خود کھا لیا اور دوسرا کُتّے کے لِیے رکھ لیا۔ پوری چھٹّی ہوئی تو بھوک کے مارے اُس کا بُرا حال تھا اور اُسے "ٹونکل ٹونکل لٹل اِسٹار" نظر آرہے تھے۔ لیکن اُس نے کتّے کی امانت میں خیانت نہ کی۔

وہ گلی میں داخل ہونے کے لِیے جیسے ہی مُڑا، کُتّا اُس کے پیروں میں آکر لوٹنے لگا۔ وہ اُس کا اِنتظار کرتے کرتے گلی کے نکڑ تک پہنچ گیا تھا۔ شعیب کی بو پا کر اُس نے زور زور سے دُم ہلائی اور حلق سے طرح طرح کے سُر نکالنے لگا۔ شعیب سمجھ گیا کہ یہ میری راہ دیکھ رہا تھا۔ اُس نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اُسے بجلی کے کھمبے کے پاس لے گیا۔ یہاں اُس نے بستے میں سے ڈبّا نکالا اور باقی کھانا اُس کے آگے ڈال کر گھر کی طرف چل دیا۔

کتّا کھانا چھوڑ کر شعیب کے پیچھے بھاگا اور اُس کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔ مگر شعیب کی امّی نے اُسے باہر نکال کر اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ اِس کے بعد انھوں نے شعیب کو کھانا دیا اور پیار سے سمجھایا کہ مہنگائی اِتنی ہے کہ ہم اپنا کھانا جانوروں کو نہیں دے سکتے۔ ہاں، فالتو ہو تو بے شک دے دو۔ شعیب کی سمجھ میں بھلا یہ بات کیا آتی۔ وہ تو صرف اِتنا جانتا تھا کہ بھوک انسان کی ہو یا جانور کی، ایک سی ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اُس کتّے کو وہ اپنا دوست سمجھنے لگا تھا، اور دوست کے لِیے کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

شام کو شعیب کے ابّو نے دیکھا کہ ایک کتّا گھر کی دہلیز پر ڈیرا جمائے بیٹھا ہے۔ اُنھیں کتّے ویسے بھی بھلے نہیں لگتے تھے۔ انھوں نے ڈانٹ کر اُسے بھگا دیا اور وہ کُوں کُوں کرتا ہوا کھمبے کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

صبح کو شعیب نے اُسے پھر اپنا آدھا کھانا دے دیا، اور اِس کے بعد اُس کی یہ روز کی عادت بن گئی۔ دن رات گزرتے رہے۔ چھوٹا کتّا اب چھوٹا نہیں رہا تھا۔ بڑا ہو گیا تھا۔ وہ روزانہ شعیب کے ساتھ اِسکول جاتا اور گیٹ کے باہر پوری چھٹّی تک اُس کا اِنتظار کرتا۔ پھر اُس کے ہمراہ واپس آجاتا۔ کبھی آگے آگے، کبھی پیچھے پیچھے۔

شعیب ایک خوب صورت اور گول مٹول سا لڑکا تھا اور دور ہی سے پہچانا جاتا تھا۔ مگر اُس کتّے کے لِیے اُس کی بُو باس ہی سب سے بڑی پہچان تھی۔ کتّا سینکڑوں کے مجمعے میں اپنے آقا کو پہچان لیتا ہے۔ لٰہذا شعیب کو کبھی اُسے آواز دینا نہ پڑتی۔ وہ اُس کی بو سونگھتے ہی اُس کے پاس دوڑا چلا آتا۔ شعیب نے اُس کا نام کھمبُو رکھا تھا۔ یہ نام اُس کھمبے کی وجہ سے تھا، جہاں پہلی بار اِن دونوں کی مُلاقات ہوئی تھی۔

ایک دِن پوری چھٹّی کے بعد، اِسکول کی دوسری گلی کے موڑ پر، ایک کار آکر رُکی۔ اُس کے پچھلے دروازے کُھلے اور اندر سے دو نقاب پوش باہر نکلے۔ ایک کے ہاتھ میں پستول تھا، دوسرے نے رسّی سنبھال رکھی تھی۔ پستول والا کار کے پاس ہی رُکا رہا۔ رسّی والا شعیب اور دو اور لڑکوں کو پکڑ کر کار کے اندر دھکیلنے لگا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ تینوں لڑکے نقاب پوش کی گرِفت سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک لڑکے نے اُس کی ٹانگ پر کاٹنا چاہا تو اُس نے ایک زوردار تھپّڑ رسید کر دیا۔ کھمبُو پاس کھڑا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ یہ آدمی اُس کے دوست اور اُس کے دو ساتھیوں کو مار رہے ہیں تو وہ بھی بھونکتا ہُوا آگے بڑھا اور رسّی والے کی پنڈلی میں دانت گاڑ دیے۔ پستول والے نے کھمبُو کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی جو اُس کی ٹانگ پر لگی۔ لیکن زخمی ہونے کے باوجود وہ نقاب پوش سے لڑتا رہا۔

گولی کی آواز سُن کر لوگ گھروں سے نکل آئے تھے لیکن اُن کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی دونوں نقاب پوش گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ لوگ "پکڑو، پکڑو" کا شور مچاتے ہوئے گاڑی کے پیچھے دوڑے مگر وہ ہوا ہو گئی۔ اُس کے پیچھے نمبر پلیٹ بھی نہیں لگی تھی۔

شعیب نے لوگوں سے کہا "میرا دوست کھبو زخمی ہو گیا ہے۔ پہلے اِسے ہسپتال لے چلیں۔ اِسی نے ہمیں اُن بدمعاشوں سے بچایا ہے"۔

"کون کھبو؟" لوگوں نے دوسرے لڑکوں کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا۔

شعیب نے کتّے کی طرف اِشارہ کیا جو لیٹا ہانپ رہا تھا اور اُس کی ٹانگ سے خون بہ رہا تھا۔ ایک شخص نے کہا کہ اِسے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ اُس کا کلینک پاس ہی ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کھبو کو ڈاکٹر کے پاس کس طرح لے جایا جائے؟ ایک بزرگ نے اپنی چادر پیش کی کہ اِس میں ڈال کر لے چلیں۔ لیکن دوسرا شخص بولا کہ چادر کی ضرورت نہیں۔ سامنے پرچون کی دُکان ہے۔ وہاں سے ایک خالی بوری لے لیتے ہیں۔ ایک شخص دوڑ کر دُکان سے بوری لے آیا۔ کھبو کو اُس پر لِٹا دیا گیا اور پھر دو آدمی اُسے اُٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ لوگوں نے شعیب سے کہا کہ بیٹا' آؤ' ہم تمہیں گھر چھوڑ آتے ہیں۔ مگر وہ راضی نہ ہُوا۔ اُس نے کہا "میں کھبو کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ آپ اِن لڑکوں کو اِن کے گھر چھوڑ آئیں"۔

شعیب نے ڈاکٹر سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح اِس بے زبان کی جان بچانے کی کوشش کرے۔ اِس نے میری اور میرے دوستوں کی جان بچائی ہے۔ ڈاکٹر نے کھبو کے ٹیکا لگایا۔ پھر مُعاینے کے بعد بتایا کہ گولی نکل گئی ہے۔ ایک ہفتے تک یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اُس نے شعیب کو تاکید کی کہ وہ کھبو کو روزانہ پٹّی بدلوانے کے لِیے لائے۔

شعیب کے پاس ڈاکٹر کو فیس دینے کے لِیے پیسے نہیں تھے۔ اُس نے اپنی کلائی کی گھڑی اُتار کر ڈاکٹر کی طرف بڑھائی اور کہا کہ اِسے رَکھ لیں۔ میں گھر جا کر آپ کو فیس بھیج دوں گا۔ ڈاکٹر ہنس پڑا۔ اُس نے پیار سے شعیب کے گالوں کو تھپ تھپایا اور کہا "بیٹے' ہر مریض سے فیس نہیں لی جاتی۔ اور پھر یہ تو ایسا کُتّا ہے کہ اِس کی جتنی بھی خدمت کی جائے کم ہے۔ اِس نے تین اِنسانوں کی جان بچائی ہے"۔

جب شعیب کافی دیر تک گھر نہیں آیا تو اُس کی امّی کو

فکر ہوئی اور وہ اسے دیکھنے کے لِیے گھر سے نکلیں۔ جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچیں تو اُنھیں دُور سے شعیب نظر آیا۔ اُس کے اِردگِرد لوگ کھڑے تھے۔ وہ گھبرائیں کہ خدا خیر کرے۔ جب لوگوں نے اُنہیں بتایا کہ اُن کا بیٹا بدمعاشوں کے چُنگل سے بال بال بچاہے اور اُسے بچانے والا یہ کتّا ہے تو اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ انھوں نے لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور اپنے بیٹے کو لے کر گھر کی طرف مُڑنے لگیں تو شعیب نے کہا کہ کھمبُو بھی میرے ساتھ جائے گا ورنہ میں نہیں جاؤں گا۔ شعیب کی والِدہ کھمبو کو بھی گھر لے گئیں اور صحن کے ایک گوشے میں اُس کے لِیے جگہ بنادی۔

رات کو جب شعیب کے ابّو آئے اور اُنھوں نے یہ قصّہ سُنا تو کتّے کی بہادُری سے بہت مُتأثِر ہوئے مگر اُسے دیکھنے نہیں گئے۔ انھوں نے بیوی سے کہا کہ کل سے شعیب کو اسکول چھوڑنے میں جاؤں گا اور لینے تم جایا کرو گی۔ شعیب نے کہا "ٹھیک ہے، مگر میں تین چار روز اسکول نہیں جاؤں گا۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس کھمبُو کی پٹّی بدلوانے کے لِیے جانا پڑے گا"۔

چار دن تک شعیب اور اُس کی امّی کھمبُو کی تیمارداری کرتے رہے۔ کھمبو کی پٹّی بدلوانے میں گلی کے لڑکوں نے بھی شعیب کا ساتھ دیا۔

پانچویں روز شعیب اپنے ابُّو کے ساتھ اِسکول جانے کے لِیے گھر سے نکلا تو کھمبو کو یہ ناگوار گزرا۔ اُس کا زخم اب ٹھیک ہو گیا تھا اور وہ چلنے پھرنے لگا تھا۔ وہ بھونکتا ہوا کبھی شعیب کے ابّو کی طرف بڑھتا تو کبھی شعیب کی طرف۔ شعیب سمجھ گیا کہ اِسے میرا ابّو کے ساتھ اسکول جانا پسند نہیں۔ اِسی لِیے ناراض ہو رہا ہے۔ شعیب کے ابّو نے اُسے بہتیرا ڈرایا دھمکایا مگر وہ باز نہ آیا۔ اُس نے ابّو کی پتلون کا پائنچا پکڑا اور لگا کھینچنے۔ اِس کش مکش میں پائنچا پِنڈلی تک چاک ہو گیا۔ شعیب کے ابّو کو غصّہ آگیا۔ اُنھوں نے اُسے مارنے کے لِیے چھڑی اُٹھائی تو شعیب نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "نہیں ابّو، ایسا نہ کریں۔ اِسے آپ کا میرے ساتھ جانا پسند نہیں۔ اِسے کچھ نہ کہیں۔ اگر اُس وقت یہ ہماری مدد نہ کرتا تو آپ کا بیٹا گھر کے بجائے بدمعاشوں کے قبضے میں ہوتا۔ اب کھمبو ہی میرے ساتھ اسکول جایا کرے گا اور یہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچنے دے گا"۔

"اچھا بیٹا۔ پھر میں بے فِکر ہو کر کام پر جاتا ہُوں" شُعیب کے ابّو نے ڈنڈے والا ہاتھ نیچے کرتے ہوئے کہا۔

شُعیب کے ابّو چلے گئے تو کھمبُو خوش ہو کر بھونکا اور پھر شُعیب کے ساتھ دُم ہلاتا ہوا اِسکول کی طرف چل دیا۔

پاؤں سو کیوں جاتے ہیں

پاؤں میں سُوئیاں سی چُبھنے لگیں اور وہ سُن ہو جائے تو ہم کہتے ہیں کہ پاؤں سو گیا ہے۔ ایسا، عام طور پر، اُس وقت ہوتا ہے جب ہم ٹانگیں دوہری کرکے بیٹھے ہوں۔

مُڑی ہوئی ٹانگ ربڑ کی اُس نلکی کی طرح ہوتی ہے جس میں بَل پڑ گئے ہوں۔ جس طرح مُڑی ہوئی نلکی میں پانی کا بہاؤ سُست ہو جاتا ہے، اِسی طرح مُڑی ٹانگ کی نالیوں میں خون کے بہاؤ کی رفتار سُست پڑ جاتی ہے، جس کی وجہ سے خون اپنے کام اچھی طرح نہیں کر سکتا۔

اِن کاموں میں ایک کام جِسم سے گندے مادّوں کو باہر نکالنا ہے۔ جب یہ گندے مادّے اپنی جگہ سے نہیں ہلتے تو اِس سے پاؤں کے اُن اَعصاب کے کام میں رُکاوٹ پڑتی ہے جو دماغ کو پاؤں کے بارے میں خبریں بھیجتے ہیں۔ اِس رکاوٹ کی وجہ سے دماغ کا پاؤں سے تعلّق ٹوٹ جاتا ہے اور پاؤں سُن ہو جاتا ہے۔ جب ہم پاؤں سیدھا کرتے ہیں تو خون پھر، پہلے کی طرح، نالیوں میں بہنے لگتا ہے اور اعصاب کے ذریعے پاؤں کا تعلّق دماغ سے قائم ہو جاتا ہے۔

(س-ل)

بچّوں کے لیے درسِ قرآن

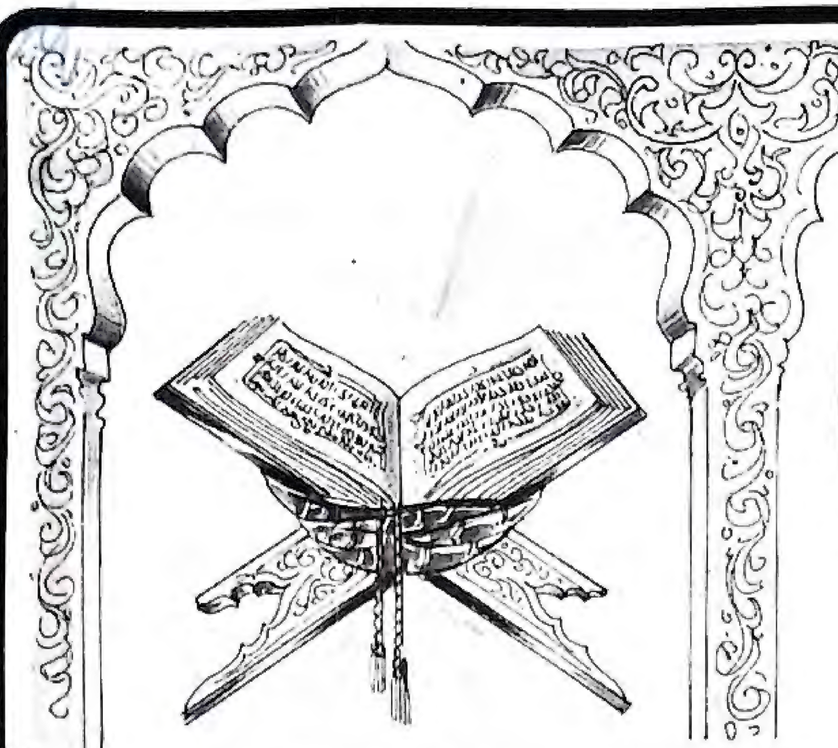

درسِ قرآن

فساد مت کرو

بچّوں کے لیے درسِ قرآن میں اِس دفعہ ہمارا موضوع ہے: فتنہ و فساد، لڑائی جھگڑا وغیرہ۔

موضوع کی وضاحت کے لیے ہم نے سُورہ بقرہ کی آیت نمبر 205 کا یہ آخری جملہ منتخب کیا ہے:

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

اَللّٰہُ لَا یُحِبُّ الفَسَاد

"اللہ تعالیٰ فساد پسند نہیں فرماتے۔"

فساد خواہ کسی پیمانے پر اور کسی جگہ ہو، بہت بُری حرکت ہے۔ گھروں میں ماں باپ اور بال بچّوں کے درمیان خوش گوار تعلّقات سے ماحول کس قدر خوب صورت دکھائی دیتا ہے۔ ذرا لڑائی جھگڑا ہو تو سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گلی محلّے کے دنگے فسادوں سے زندگی کا لُطف ختم ہو جاتا ہے۔ ملکی سطح پر فساد اور ہنگامے تو خالص شیطانی کام ہیں۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ کراچی اور بعض دوسرے شہروں سے بھی طرح طرح کے فسادوں کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ خصوصاً مسجدوں میں دنگا فساد، فائرنگ اور بم باری تو بہت ہی بُری حرکتیں ہیں۔ مسجد اللہ کا گھر ہے۔ عبادت کے علاوہ آپس میں اُخوّت بڑھانے کے لیے مسجد بہترین مقام ہے۔ اگر یہ مُقدّس مقام بھی فتنہ و فساد کی زد میں آجائے تو یہ سب کے لیے باعثِ اذیّت ہوگا۔

یہ تأثّر عام ہے کہ ہمارے ان فسادوں میں ہندوستان کا ہاتھ ہے۔ اسلام اور پاکستان کے تمام دشمن اس قسم کی گڑبڑ پر بغلیں بجاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر پکّے مسلمان اور ہر سچّے پاکستانی کو ہر قسم کے دنگے فساد کی سخت مذمّت کرنی چاہیے۔ فتنہ و فساد سے خود بچنا اور دوسروں کو اس سے بچنے کی تلقین کرنا، ہم سب کے لیے مبارک بھی ہے اور مفید بھی۔

ڈاکٹر عبدالرؤف

دانائی کی باتیں

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

تین کہانیاں

سنہری چڑیا نے کہا:

آج میں آپ کو تین مختصر، سبق آموز کہانیاں سُنانا چاہتی ہوں۔ انہیں غور سے سُنیں۔

کہتے ہیں کہ ایک جنگل میں دو سانڈ رہتے تھے۔ اُن میں بڑی دوستی تھی۔ اِتفاق سے وہاں ایک شیر آگیا اور سانڈوں کو دیکھ کر اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ اُس نے گھات لگا کر ایک سانڈ کو دبوچنے کی کوشش کی تو دوسرے سانڈ نے اُس پر حملہ کر دیا۔ دونوں سانڈ مِل کر اُس پر پِل پڑے اور شیر تاب نہ لا کر بھاگ اُٹھا۔

اِس کے بعد بھی شیر نے دو تین بار کسی سانڈ کو دبوچنے کی کوشش کی، مگر اُن دونوں کا مُقابلہ نہ کر سکا۔ آخر کار اُس نے اُن سانڈوں میں پھوٹ ڈالنے کی تدبیر سوچی۔

لومڑی اپنی عیّاری کے لِیے مشہور ہے۔ شیر نے اُس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور پھر ایک دن اُسے اُن سانڈوں میں پھُوٹ ڈالنے کو کہا۔ لومڑی نے کہا "شیر ماموں، یہ کون سا مشکل کام ہے۔ میں اُن میں جلد پھُوٹ ڈال دُوں گی"۔

چنّاں چہ لومڑی نے پہلے ایک سانڈ سے دوستانہ انداز میں کہا "سانڈ چچا، آپ تو بہت اچھے ہیں۔ لیکن آپ کا دوست آپ کے خِلاف ایسی ایسی باتیں کرتا ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ خدا کے لِیے اُسے میرا نام نہ بتانا ورنہ وہ مجھے مار ڈالے گا"۔ لومڑی نے پہلے ایک سانڈ کے کان بھرے اور اُسے اُس کے دوست سے بدظن کیا۔ پھر دوسرے سانڈ سے لگائی بجھائی کر کے اُسے اپنے دوست سانڈ سے بدگمان کر دیا۔

اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں سانڈوں میں ٹھن گئی۔ وہ ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے اور پھر ایک دوسرے سے الگ رہنے لگے۔ شیر اِسی موقع کی تلاش میں تھا۔ اُس نے پہلے ایک سانڈ کو دبوچا اور اُس سے پیٹ بھرا۔ پھر موقع پا کر دوسرے سانڈ پر حملہ کر دیا اور اُسے بھی ہڑپ کر گیا۔

سُنہری چڑیا بولی: پیارے بچّو، آپ نے دیکھا کہ جب تک دونوں سانڈوں میں اِتفاق رہا، شیر اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ لیکن جب لومڑی کی لگائی بجھائی سے اُن میں اِتفاق نہ رہا تو شیر نے ایک ایک کر کے دونوں کو اپنا نِوالہ بنا لیا۔ یہ ہوتا ہے نااِتفاقی کا نتیجہ۔

پیارے بچّو، اب میں اِس موضوع پر ایک اور نصیحت آموز کہانی سُناتی ہوں۔

ایک تھا بہت مالدار زمین دار۔ اُس کے پانچ بیٹے تھے۔ اُس کے گاؤں میں ایسے لوگ بھی تھے جو اُس سے حسد کرتے تھے۔ کبھی کبھی اُن سے اُس کا جھگڑا بھی ہو جایا کرتا تھا۔ جب وہ مرنے کے قریب ہوا تو اُس کے دل میں خوف پیدا ہوا کہ کہیں میرے بعد میرے بیٹے جائداد کے لالچ میں آپس میں اُلجھ نہ پڑیں اور اُن میں اِتفاق نہ رہے۔ اگر اُن میں اِتفاق نہ رہا تو وہ کم زور ہو جائیں گے اور دُشمن اُن پر قابُو پالیں گے۔

چُناں چہ اُس نے اپنے بیٹوں کو بُلایا اور ایک بیٹے کو تیلیوں کا ایک گٹھا دے کر کہا "اِسے توڑ کر دکھاؤ"۔ بیٹے

نے پُورا زور لگایا مگر وہ گٹھا نہ توڑ سکا۔

اب زمیندار نے باری باری سب بیٹوں کو گٹھا توڑنے کے لیے کہا۔ سب نے کوشش کی اور پُورا زور لگایا مگر وہ گٹھے کو توڑ نہ سکے۔

اب زمیندار نے گٹھے کو کھولا اور ایک ایک تِیلی پانچوں بیٹوں کو توڑنے کے لیے دی۔ ہر ایک نے بغیر زور لگائے اُسے توڑ دیا۔

اِس پر زمیندار نے اپنے بیٹوں سے کہا "دیکھا تم نے؟ جب تیلیاں اکٹھی تھیں تو اُن کو توڑنا مُشکل تھا۔ لیکن جب وہ الگ الگ ہو گئیں تو اُن کو توڑنا آسان ہو گیا۔ اِسی طرح اگر تم میں اِتّفاق رہا اور تم اِکٹھے رہے تو دُشمن تمھارا بال بیکا نہیں کر سکیں گے۔ لیکن اگر تم میں اِتّفاق نہ رہا اور تم الگ الگ ہو گئے تو دُشمنوں کا تم پر قابُو پا لینا آسان ہو گا۔ یاد رکھو! اِتّفاق میں بڑی قُوّت اور برکت ہوتی ہے"۔

یہ کہانی سُنا کر سُنہری چِڑیا بولی "پیارے بچّو، اب میں آپ کو ایک اور سبق آموز کہانی سُناتی ہوں۔

ایک گاؤں میں دانش مند نام کا ایک زمیندار رہتا تھا۔ اُس کے چار بیٹے تھے۔ وہ بہُت سُست اور کاہِل تھے، حال آں کہ اُن کا باپ بڑا محنتی اور جفاکش تھا۔ اِس کے عِلاوہ وہ عقل مند اور دُور اندیش بھی تھا۔ اُسی کی محنت کا نتیجہ تھا کہ اُس کا گھرانا خوش حال تھا۔

بد قسمتی سے دانش مند کو ایک مُوذی مرض لاحق ہو گیا اور اُس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ طبیبوں نے عِلاج میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی، لیکن مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی۔ جب وہ مرنے کے قریب ہوا تو اُس نے بیٹوں سے کہا کہ میں نے کھیت میں خزانہ دفن کر رکھا ہے۔ میرے بعد تم اُسے ڈھونڈ کر نکال لینا اور آپس میں اِنصاف سے بانٹ لینا۔ دیکھو، اُس کے لیے تمھیں تمام زمین کو گہرا کھودنا ہو گا۔

دانش مند اِنتقال کر گیا تو اُس کی ہدایت کے مُطابق اُس کے بیٹوں نے خزانے کی تلاش میں کھیت کا کونا کونا کھود ڈالا، لیکن خزانہ نہ ملا۔ بہرحال، اُن کی محنت رائگاں نہ گئی۔ اُنھوں نے اُس میں گندم کاشت کر دی۔ زمین چُوں کہ نرم تھی اور گہری کھُدی ہوئی تھی، اِس لیے فصل بہُت اچھی ہوئی۔ یہ دیکھ کر لڑکے بہُت خوش ہوئے۔ فصل بیچ کر اُنھوں نے خوب پیسہ کمایا۔

یہ دیکھ کر دانشمند کے بڑے بیٹے نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ ہمارے باپ کا نام دانشمند تھا یعنی عقل مند۔ وہ واقعی عقل مند تھا۔ اُس نے بڑی دانش مندی سے ہمیں اِس راز سے آگاہ کیا کہ خوب محنت کرو، خوب کماؤ۔ اب ہم اِن شاء اللہ آیندہ بڑی محنت سے کاشت کاری کے لیے زمین کھودا کریں گے۔ چُناں چہ اُنھوں نے ایسا ہی کیا اور خوب پیسہ کمایا۔

سُنہری چڑیا نے کہا، پیارے بچّو، اِن کہانیوں سے ہمیں اِن اصُولوں سے آگاہی ہوتی ہے کہ

(ا) اِتّفاق میں قُوّت و برکت ہوتی ہے۔ اِس لیے ہمیں گھربار، خاندان اور مُلک میں اِتّفاق سے رہنا چاہیے۔ قوم میں اِتّفاق و اِتّحاد ہو تو دُشمن اُسے شِکست نہیں دے سکتا۔

(ب) محنت کام یابی اور خوش حالی کی کُنجی ہے اور اِس کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دُنیا میں جس شخص اور قوم نے محنت و مُشقّت کی، بڑائی اُسے ہی ملی اور اُسی نے ترقّی کی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آپ جانتے ہیں؟

☆ امریکا میں مُرغیاں ایک منٹ میں تقریباً 1,380,000 انڈے دیتی ہیں۔

☆ دُنیا میں ایک منٹ میں تقریباً 238 بچّے پیدا ہوتے ہیں، اور 97 لوگ مرتے ہیں۔

☆ دنیا کی سب سے اُونچی آب شار "اینجلز فالز" ہے۔ 3212 فُٹ اُونچی یہ آب شار جنوبی امریکا کے ایک مُلک، وینیزویلا، میں ہے۔

☆ سورج کے اندر کا درجۂ حرارت 3 کروڑ ڈگری فارن ہائیٹ کے لگ بھگ ہے۔

☆ ستارہ مچھلی ایک سال میں 20 کروڑ کے قریب انڈے دیتی ہے۔

☆ الیکٹرک کیٹ فِش (برقی بِلّی مچھلی) کے جسم سے 350 وولٹ بجلی خارج ہوتی ہے۔ یہ مچھلی، جس کی شکل بلّی کی سی ہوتی ہے، اپنے شکار کو بجلی کا جھٹکا لگا کر مارتی ہے اور پھر اُسے کھا جاتی ہے۔

☆ ایک عام اِنسان کے جسم کی چربی سے صابن کی سات ٹکیاں بنائی جا سکتی ہیں۔

☆ مُلک ڈنمارک کا ایک ماہرِ اَلسِنہ (زبانوں کا ماہر) 135 مختلف زبانیں بول سکتا تھا۔

☆ پُرانے زمانے کی جاپانی عورتیں اپنے دانتوں پر سیاہ پینٹ کرواتی تھیں۔ اُس زمانے میں کالے دانت خوب صورتی میں شُمار ہوتے تھے۔

☆ نیوزی لینڈ کے ایک گاؤں کا نام Doubtful Sound (مشکوک آواز) ہے۔

☆ شُتر مرغ کی مادہ کے ایک انڈے کا آملیٹ 12 آدمی کھا سکتے ہیں۔

☆ جھینگا مچھلی (Lobster) کا خون نیلا ہوتا ہے۔

☆ کھیرا اور ٹماٹر سبزی نہیں، پھل ہیں۔

☆ کیوبا کے ملک میں مگرمچھوں کا ایک فارم ہے۔ اِس میں 12,000 مگرمچھ ہیں۔

☆ 1969ء میں، سویڈن میں، سیاہ رنگ کی برف پڑی تھی۔

☆ مینڈک کی گردن نہیں ہوتی، اِس لیے وہ اپنا سر نہیں گھما سکتا۔

☆ انگلینڈ کے ایک شہر، بریڈفورڈ، کے قریب ایک قصبہ ہے، کیمپٹن۔ اِس میں صرف ایک ہی گلی ہے، اور وہ سات میل لمبی ہے۔

☆ ہم اپنی زندگی کا ایک تہائی حصّہ سو کر گزُارتے ہیں۔

☆ بِلّی اپنی زندگی کا دو تہائی حصّہ سو کر گزُارتی ہے۔

☆ انگلستان کا بادشاہ، چارلس اوّل، بونا تھا۔

☆ شیکسپیئر کے زمانے میں (آج سے چار سو سال پہلے) عورتیں تھیٹر میں کام نہیں کرتی تھیں۔ اُن کے پارٹ بھی مرد ہی کرتے تھے۔

****

بقیہ: علمی آزمائش

تین غلطی والے 12 حل موصول ہوئے۔ اِن میں سے 10 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی 15،15 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں۔

محمّد احمد نصیر لاہور۔ جویریہ حُسین لاہور۔ روبینہ امجد قریشی لاہور۔ محمّد وسیم منڈی بہاءُ الدّین۔ کامران رفیق قریشی ملتان۔ مہتاب اِسماعیل لاہور۔ سلمان جاوید لاہور چھاؤنی۔ اِعجاز لطیف لاہور۔ عرفان شہزاد میاں والی۔ خیّام اِقبال کرتار پورہ۔

من موجی

ڈاکٹر رضوان ثاقب

یہ اُس وقت کی کہانی ہے جب دنیا کے سارے جانور جنگلی تھے۔ کتّا جنگلی تھا، گھوڑا جنگلی تھا، گائے جنگلی تھی، بھیڑ جنگلی تھی۔ اِن سب جانوروں میں جنگلی عادتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں اور یہ گھنے جنگلوں میں رہتے تھے۔ ان جانوروں میں سب سے زیادہ جنگلی بِلّی تھی۔ وہ بہت آزاد اور خود سر تھی۔ انسان بھی جنگلی تھا۔ وہ جنگلی جانوروں کا گوشت کھاتا اور انھی کی کھال سے تن ڈھانپتا تھا۔

یہ اُسی زمانے کی بات ہے کہ ایک مرد اور اس کی بیوی نے کسی جنگل میں ایک غار کے اندر اپنا گھر بنایا اور پھر دونوں اس میں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ وہ پتّھر کو آگ سے تپا کر اس پر جانوروں کا گوشت بھُونتے اور اس پر لہسن اور مرچیں لگا کر کھاتے۔

ایک دن رات کو غار کے باہر تمام جنگلی جانور اکٹھے ہوئے اور غار میں جلنے والی آگ کے بارے میں حیرانی سے سوچنے لگے۔ پھر جنگلی گھوڑے نے اپنے کھُر زمین پر مار کر کہا "دوستو، آپ کو معلوم ہے کہ اس غار میں آگ کیوں جل رہی ہے اور رات کو یہاں سے جو آوازیں آتی ہیں وہ کیسی ہیں؟"

کتّے نے ناک سُکیڑ کر کچھ سونگھتے ہوئے کہا "میں وہاں جا کر دیکھتا ہوں۔ مگر اِس کام کے لیے بِلّی کو میرے ساتھ جانا ہو گا"۔

"اُوں ہُوں۔ ہر گز نہیں" بلّی نے سر ہلاتے ہوئے کہا "میں من موجی ہوں، اپنی مرضی کی مالک۔ سب جگہیں میری جانی پہچانی ہیں۔ میں جہاں چاہوں اکیلی جا سکتی ہوں۔ پھر بھلا تمھارے ساتھ کیوں جاؤں"؟

کتّے نے کہا "لیکن یاد رکھو! میرے ساتھ نہ گئیں تو ہماری دوستی ختم ہو جائے گی"۔

بلّی نے کتّے کی دھمکی کی پروا نہ کی اور کتّا اکیلا ہی غار کی طرف چل پڑا۔ ابھی اس نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ بلّی نے اپنے آپ سے کہا "یہ سب جگہیں میری جانی پہچانی ہیں۔ پھر میں وہاں کیوں نہیں جا سکتی؟ میں بھی جاتی ہوں، مگر اپنی مرضی سے"۔

وہ چُپکے سے کتّے کے پیچھے ہو لی۔ غار کے قریب پہنچ کر وہ ایسی جگہ چھپ گئی جہاں سے وہ غار کے اندر ہونے والی باتیں سُن سکتی تھی۔ جب کتّا غار کے مُنہ پر پہنچا تو اسے غار

کے اندر سے بھُنے ہوئے گوشت کی خوش بو آئی۔ اُس کے مُنہ میں پانی آگیا۔

عورت نے جب کتے کو رال ٹپکاتے ہوئے دیکھا تو پہلے مسکرائی، پھر کہنے لگی "اے ہڈی کھانے والے جنگلی جانور، تم میرے پاس آنے والے پہلے جانور ہو۔ بتاؤ، کیا چاہتے ہو"؟

کتے نے کہا "اے میری دُشمن اور میرے دشمن کی گھر والی، غار کے اندر سے خوش بو کس چیز کی آرہی ہے؟"

عورت نے ایک بُھنی ہوئی ہڈی اُٹھائی اور اسے کتے کی طرف پھینک کر اسے کھانے کو کہا۔ کُتّے نے ہڈی کو چبایا اور کہنے لگا "یہ تو بہت مزے دار ہے۔ اتنی لذیذ چیز میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں کھائی"۔ پھر اس نے ایک اور ہڈی مانگی تو عورت نے کہا "اے جنگلی جانور، تم جتنی چاہو گے میں اُتنی ہی بھُنی ہوئی ہڈیاں تمھیں دوں گی۔ لیکن تمھیں دن کے وقت میرے خاوند کے ساتھ شکار کو جانا ہو گا اور رات کو ہمارے غار پر پہرا دینا ہو گا"۔

"آہ"! بلّی نے، جو اُن کی باتیں سُن رہی تھی، کہا "یہ بہت عقل مند عورت ہے۔ لیکن اتنی عقل مند نہیں جتنی میں ہوں"۔

کتّا غار کے اندر گیا اور اس نے اپنا سر عورت کے پاؤں پر رکھ کر کہا "اے میری دوست اور میرے دوست کی گھر والی، میں وعدہ کرتا ہوں کہ دن کو تمھارے خاوند کے ساتھ شکار کے لیے جاؤں گا اور رات کو تمھارے غار کی حفاظت کیا کروں گا"۔

"آہ"! بلّی نے یہ سُن کر کہا "یہ بہت بے وقوف ہے۔ اِس نے ایک ہڈّی کے عِوض اپنی آزادی بیچ دی ہے"۔ پھر وہ اپنی دُم لہراتے ہوئے واپس جنگل کی طرف چل پڑی لیکن اُس نے جنگل میں پہنچ کر اِس واقعے کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا۔

جب عورت کا شوہر میٹھی نیند سے بیدار ہوا تو اس نے اپنی بیوی سے پوچھا "یہ جنگلی کتّا یہاں کیا کر رہا ہے"؟

عورت نے کہا "اب یہ جنگلی نہیں ہے۔ یہ ہمارا دوست ہے اور ہمیشہ ہمارا دوست رہے گا۔ جب تم دن کو شکار کے لیے جاؤ گے تو یہ تمھارے ساتھ جایا کرے گا اور رات کو ہمارے غار پر چوکیداری کیا کرے گا"۔

اگلے دن عورت نے تازہ سبز گھاس چراگاہ سے کاٹی اور اسے آگ کے پاس رکھ کر خشک کیا۔ اس کی خوش بو چاروں طرف پھیل گئی۔ اس کے بعد عورت غار کے مُنہ پر بیٹھ گئی۔

اُدھر جنگل کے تمام جانور کتّے کے بارے میں پریشان تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ نہ جانے کتّے کو کیا ہوا، جو وہ ابھی تک واپس نہیں لوٹا۔ آخر گھوڑا آگے بڑھا اور اس نے کہا "میں جا کر دیکھتا ہوں کہ وہ واپس کیوں نہیں آیا۔ لیکن بلّی کو میرے ساتھ جانا ہو گا"۔

"اُوں ہُوں۔ ہرگز نہیں" بلّی نے کہا "میں من موجی ہوں، اپنی مرضی کی مالک۔ تمام جگہیں میری جانی پہچانی ہیں۔ میں تمھارے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی"۔ لیکن جب گھوڑا غار کی طرف گیا تو وہ بھی اُس کے پیچھے ہولی اور پھر غار کے پاس چھُپ کر بیٹھ گئی۔

جب عورت نے گھوڑے کی ٹاپوں ک آواز سُنی اور اس کی گردن کی لمبی جھُولتی ہوئی ایال کو دیکھا تو وہ ہنسی اور کہنے لگی "اے جنگل سے آنے والے دوسرے جنگلی جانور، بتاؤ تم کیا چاہتے ہو"؟

گھوڑے نے کہا "اے میری دشمن اور میرے دشمن کی گھر والی، بتاؤ، جنگلی کتّا کہاں ہے؟"

عورت مسکرائی اور کہنے لگی "مجھے علم ہے کہ تم یہاں کُتّے کے لیے نہیں آئے ہو۔ تم تو ہری ہری گھاس کی خوش بو سُونگھ کر یہاں آئے ہو۔"

گھوڑے نے اگلے پاؤں پتھریلی زمین پر رگڑتے ہوئے اپنی گھنی ایال کو ہلایا اور کہا "یہ سچ ہے۔ مجھے وہ مزے دار چیز جس کی خوش بو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے جلدی دو"۔

عورت نے کہا "جنگلی جانور، اپنا سر جھکاؤ اور دیکھو تمھیں کتنی مزے دار گھاس دے رہی ہوں"۔

"آہا!" یہ سُنتے ہی بلّی نے کہا "یہ بہت چالاک عورت ہے۔ لیکن اتنی چالاک نہیں جتنی میں ہوں"۔

جنگلی گھوڑے نے اپنی گردن جُھکادی اور عورت نے اُس کے گلے میں رسّی ڈال دی۔ گھوڑے نے عورت کے پاؤں کو چاٹا اور کہا "اے میری مالک اور اے میرے مالک کی گھر والی، تم مجھے یہ مزے دار گھاس روز دیا کرنا۔ اس کے بدلے مَیں تمہاری خدمت کروں گا"۔

"آہ"! بلّی نے یہ سُن کر کہا "یہ بہت بے وقوف گھوڑا ہے۔ اِس نے ذرا سی گھاس کے لیے انسان کی غلامی قبول کر لی ہے"۔ یہ کہہ کر وہ دُم لہراتی ہوئی جنگل کی طرف چل پڑی۔ لیکن جنگل میں جا کر اُس نے اِس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا۔

جب عورت کا شوہر اور کتّا شکار سے واپس آئے تو آدمی نے کہا "یہ جنگلی گھوڑا یہاں کیا کر رہا ہے"؟

عورت نے کہا "اب یہ جنگلی نہیں ہے۔ یہ ہمارا نوکر ہے۔ تم اِس پر سوار ہو کر کتّے کے ساتھ شکار کھیلنے جایا کرو گے۔"

اگلے دن گائے غار کے مُنہ پر آئی اور بلّی پھر اُسی طرح اُس کا پیچھا کرتے ہوئے غار کے پاس چُھپ کر بیٹھ گئی۔ گائے نے بھی عورت کے ساتھ ویسا ہی سودا کیا جیسا کتّے اور گھوڑے نے کیا تھا۔ اُس نے چارے کے بدلے میں عورت کو دودھ دینے کا وعدہ کیا۔ بلّی پہلے ہی کی طرح اپنی دُم لہراتی ہوئی جنگل میں واپس چلی گئی۔ لیکن اُس نے اِس بار بھی اِس واقعے کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا۔

جب عورت کا شوہر، کتّا اور گھوڑا شکار سے واپس لوٹے اور شوہر نے عورت سے گائے کے بارے میں پُوچھا تو اس نے کہا "یہ اب جنگلی گائے نہیں۔ اب یہ ہماری پالتُو ہے۔ یہ ہمیں گرم گرم دودھ دیا کرے گی اور جب تم کتّے اور گھوڑے کے ساتھ شکار کے لیے جایا کرو گے تو میں اِس کی دیکھ بھال کیا کروں گی"۔

اگلی صبح بلّی نے اِنتظار کیا کہ کوئی اور جنگلی جانور غار کی

طرف جائے لیکن کوئی بھی اُس طرف نہ گیا۔ اِس پر وہ خود ہی چل پڑی۔ جب وہ غار کے قریب پہنچی تو اس نے عورت کو گائے کا دودھ دوہتے ہوئے دیکھا اور غار میں روشنی بھی دیکھی۔ پھر اسے گرم گرم سفید دودھ کی خوش بو آئی۔ اس نے عورت سے کہا "اے میری دشمن، اے میرے دشمن کی گھر والی، مجھے اپنے غار میں رہنے کی اجازت دو۔ مگر میں دوسرے جانوروں کی طرح تمھاری غلام بن کر نہیں رہوں گی۔ میں من موجی ہوں۔ جو جی چاہے گا کروں گی اور جہاں چاہوں گی، جاؤں گی"۔

عورت ہنسی اور کہنے لگی "تم جنگل ہی میں چلی جاؤ کیوں کہ مجھے من موجی دوست کی ضرورت نہیں۔"

ایک صبح آدمی، کتّا اور گھوڑا شکار کے لیے چلے گئے تو عورت ہانڈی روٹی میں مصروف ہو گئی۔ بچّہ اکیلا پڑا رو رہا تھا۔ بلّی چپکے سے اندر آئی اور بچّے کو باہر لے گئی۔ اُس نے اُسے گول گول، چکنے چکنے، پتھر کھیلنے کو دیے لیکن وہ چِلّاتا رہا۔ اِس پر بلّی نے اپنے نرم نرم پیروں سے اس کے گالوں کو سہلایا جس سے بچّہ مسکرانے لگا۔ بلّی نے اس کے گھٹنوں میں گُدگُدی کی اور اُس کی ٹھوڑی کے نیچے اپنی دُم سے گُدگُدایا تو بچّہ کِلکاریاں مارنے لگا۔ عورت بچّے کی آواز سُن کر باہر نکلی اور بلّی کو اس کے ساتھ کھیلتا دیکھا تو بولی "تم تو بڑی کار آمد چیز ہو۔ تم نے میرے بیٹے کو خوش کیا۔ اب تم اندر آسکتی ہو"۔

بلّی نے کہا "ہُوں تو میں واقعی بڑی کار آمد، مگر ہوں من موجی۔ میں تمھاری غلام بن کر نہیں رہوں گی۔ جو جی میں آئے گا کروں گی اور جہاں جی چاہے گا، گھوموں پھروں گی"۔

"چلو ٹھیک ہے۔ تم من موجی ہی رہو" عورت نے کہا "لیکن تم میرے بچّے کو کِھلایا کرو گی"۔

من موجی بلّی نے عورت کی یہ شرط منظور کر لی۔ اِسی دوران میں ایک چُوہا غار کے فرش پر آکر پُھدکنے لگا۔ اسے دیکھ کر بلّی نے کہا "کیا یہ چوہا بھی تمھارے اُس جادو کا حصّہ ہے جس کے ذریعے تم جنگلی جانوروں کو اپنا غلام بنا کر اُن سے اپنی مرضی کا کام لیتی ہو"؟

"نن نن نہیں، نہیں" عورت نے ڈرتے ہوئے کہا۔ وہ چوہے کو دیکھ کر کانپ رہی تھی۔

بلّی نے کہا "میں اِسے پکڑ کر کھا سکتی ہوں"۔

عورت بولی "تم اِسے جلدی سے پکڑ کر کھا لو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمھیں اور تمھارے بعد آنے والی بلّیوں کو دودھ پلایا کروں گی"۔

بلّی نے بجلی کی سی تیزی سے چھلانگ لگائی اور آن کی آن میں چوہے کو پکڑ کر کھا گئی۔ یہ دیکھ کر عورت کی جان میں جان آئی۔ اس نے کہا "تمھارا بہُت بہُت شکریہ۔ تم واقعی بہت عقل مند ہو۔ اب تم جہاں جی چاہے گھومو پھرو۔ میں تمھیں روزانہ گرم گرم دودھ پلایا کروں گی"۔

"کیا یہ پکّا وعدہ ہے؟" بلّی نے پوچھا۔

"میری طرف سے تو پکّا وعدہ ہے" عورت بولی "مگر

میں اپنے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی"۔

اُس شام جب عورت کا شوہر، کتّا اور گھوڑا گھر واپس آئے تو عورت نے شوہر کو بلّی کے مُتعلّق سب کچھ بتا دیا۔ چوہے کو پکڑ کر کھا جانے والا واقعہ خاص طور پر سُنایا۔ شوہر نے عورت کی بات سُن کر کہا "مگر اِس کا یہ مُعاہدہ میرے ساتھ اور میرے بعد آنے والے دوسرے آدمیوں کے ساتھ تو نہیں ہے"۔

اُس نے چمڑے کے دونوں جُوتے، ایک پتھّر اور ایک ڈنڈا اُٹھایا اور ان سب کو قطار میں رکھ کر بلّی سے کہا "اب ہم ایک مُعاہدہ کرتے ہیں۔ جب تم غار میں ہُوئیں اور تم نے چوہوں کو نہ پکڑا تو میں اِن چیزوں میں سے جو چیز میرے ہاتھ آئے گی، تمہارے دے ماروں گا، اور میرے بعد آنے والے دوسرے تمام آدمی بھی ایسا ہی کریں گے"۔

بلّی نے ان چاروں چیزوں کو دیکھ کر کہا "جب میں غار میں ہوئی تو چوہوں کو ضرور پکڑوں گی۔ لیکن ہوں میں من موجی۔ اپنی مرضی کروں گی اور جہاں جی چاہے گا گھوموں پھروں گی"۔

کتّے نے دانت نکال کر کہا "اگر تم نے میری مالکن کے بچّے کے ساتھ اچّھا سلوک نہ کیا تو یاد رکھو، میں تمہاری تِکّا بوٹی کردوں گا اور تم بھاگو گی تو میں تمہارا پیچھا کروں گا، اور میرے بعد آنے والے تمام کتّے بھی ایسا ہی کریں گے"۔

بلّی نے کتّے کے تیز دانتوں کی طرف دیکھا اور کہنے لگی "جب کبھی میں غار میں ہوں گی تو بچّے کے ساتھ شفقت سے پیش آؤں گی۔ لیکن صرف اِس صورت میں کہ وہ مجھے تنگ نہ کرے اور میری دُم کو زور سے نہ کھینچے"۔

کتّے نے کہا "لیکن غار میں تمہاری مرضی ہرگز نہیں چلے گی۔ باہر جو جی چاہے کرنا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہیں پکڑ لوں گا"۔

"میں اپنی مرضی کروں گی۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے" بلّی نے سینہ تان کر کہا۔ یہ سُن کر عورت کے شوہر نے بلّی کو مارنے کے لیے ڈنڈا اور جُوتے اُٹھائے۔ بلّی بھاگ کھڑی ہوئی۔ کُتّے نے اس کا پیچھا کیا۔ لیکن جب وہ درخت پر چڑھ گئی تو اسے ناکام واپس لوٹنا پڑا۔

پیارے ساتھیو، اب بھی انسان بلّی کو دیکھتا ہے تو وہ ان چار چیزوں میں سے تین چیزیں اُس کے ضرور مارتا ہے، اور تمام کتّے درخت تک اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ لیکن بلّی پھر بھی اپنا وعدہ نباہتی ہے۔ وہ جب گھر میں داخل ہوتی ہے تو چوہوں کو مارتی ہے اور بچّوں کو پیار کرتی ہے۔ ہاں، بچّے اُس کی دُم کو زور سے کھینچتے ہیں تو وہ بُرا مان جاتی ہے۔ اور جب رات کو چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہوتا ہے تو یہ بلّی ہی ہے جو اپنی دُم لہراتی ہوئی جہاں جی چاہتا ہے گھومتی پھرتی ہے۔ وہ گھنے جنگلوں، سُنسان راستوں، مکانوں کی چھتوں اور کھیت کھلیانوں میں بے دھڑک مٹر گشت کرتی ہے، کیوں کہ یہ ساری جگہیں اور تمام راستے اس کے جانے پہچانے ہیں۔

(رڈیارڈ کپلنگ کی کہانی سے ماخوذ)

اچھی باتیں

زاہدُالحسَن زاہد

جو کرتے ہیں محنت وہ پائیں گے راحت
کہ راحت بھی ہے ایک اَن مول دولت
سُنا بھی اور آنکھوں سے بھی اپنی دیکھا
کہ دُنیا میں محنت سے ملتی ہے عزّت

محبِّ[1] وطن سب اُسی کو ہیں کہتے
وطن کی جو دن رات کرتا ہے خدمت
کبھی اپنے ماں باپ سے نہ جھگڑنا
خدا کے نبیؐ کی یہی ہے نصیحت

نہ بولو کبھی تم ضرورت سے زیادہ
بہُت اچھی ہے عادتوں میں یہ عادت
ہر اِک دِل میں بھر دو محبّت کا جذبہ
تم اِک دوسرے کی کرو دِل سے عزّت

وہ محروم رہتے ہیں حق کی رِضا سے
امانت میں کرتے ہیں جو بھی خیانت
ہے اللہ کا فرمان، دِل سے کریں ہم
بُزرگوں کی تعظیم، چھوٹوں پہ شفقت

مسلماں وہی ہے جو کرتا ہے زاہد
خدا کی عبادت، نبیؐ کی اطاعت

(1) وطن سے محبت کرنے والا

بُرے کی دوستی

عفّت گُل اعزاز

شاکر ایک ذہین لڑکا تھا۔ وہ جب محنت کرتا تو اِمتحان میں شان دار کام یابی حاصل کرتا اور جب لاپروائی کرتا تو اُس کے نمبر کم آتے۔ اُس کے دو دوست تھے: نعمان اور وامِق۔ دونوں پڑھنے لکھنے کے بہت شوقین تھے اور اِمتحان میں بہت اچھے نمبر حاصِل کرتے تھے۔ یہ تینوں دوست چھٹی جماعت کے طالِبِ عِلم تھے۔

اِس سال، اِمتحان سے دو ماہ قبل، ایک نیا لڑکا اِسکول میں داخِل ہوا۔ اِتّفاق سے اُسے شاکِر کے برابر والی سیٹ ملی۔ اِس لڑکے کا نام مسعود تھا اور وہ کِھلنڈرا تھا۔ کبھی ٹیچر کی بات دِھیان سے نہ سُنتا۔ جب ٹیچر حساب کے سوال سمجھاتے تو وہ یہ سوچ رہا ہوتا کہ آج فُلاں گھر کی دیوار پھاند کر اندر جاؤں گا اور امرود کے درخت سے پکّے پکّے امرود توڑوں گا۔ جب ٹیچر اُس سے کوئی سوال کرتے تو اُلٹے سُلٹے جواب دیتا اور پھر مار کھاتا۔ شاکر نے اب نعمان اور وامِق کو چھوڑ کر مسعود سے دوستی کرلی تھی۔

چھٹّی کے بعد مسعود شاکر کو بھی اپنے ساتھ لے لیتا اور دونوں لڑکے لوگوں کے گھروں میں لگے ہوئے پھل توڑتے یا کسی دروازے کی گھنٹی بِلاوجہ ہی بجا دیتے۔ جب گھر کے اندر سے کوئی آکر دروازہ کھولتا تو ہنستے ہوئے بھاگ جاتے۔

ایک دن مسعود نے کلاس میں شاکر کو ایک قیمتی قلم دکھا کر کہا "دیکھو، کتنا عُمدہ قلم ہے"۔

"کس نے دیا؟ بڑا اچھا قلم ہے" شاکِر نے کہا۔

"دیتا کون، میرے ہاتھ کا کمال ہے" مسعود بڑے فخر سے بولا۔

"کمال؟ وہ کس طرح؟" شاکر نے حیرت سے پوچھا۔

"کل دوپہر کو ایک صاحِب میرے آگے آگے جا رہے تھے۔ اُن کی پتلون کی جیب میں یہ قلم لگا ہوا تھا۔ میں نے سوچا، ذرا سی ہوشیاری دکھاؤں۔ بس میں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھایا اور قلم میرے ہاتھ میں آگیا"۔

"یہ تو چوری ہوئی۔ تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیۓ تھا" شاکر نے کہا۔

"چوری؟ نہیں، بھئی- اِسے ہوشیاری کہتے ہیں- تم کر سکتے ہو اِس طرح؟"

"نہ تو میں ایسا کر سکتا ہوں اور نہ کرنا چاہتا ہوں- یہ بُری بات ہے" شاکر بولا-

مسعود ہنسنے لگا "دراصل ایسے کام کرنے کے لیے عقل مندی اور ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے- ہر شخص یہ کام نہیں کر سکتا- اور تم جیسا بُدّھو اور ڈرپوک لڑکا تو بالکل ہی نہیں کر سکتا"۔

"چلو، یُوں ہی سہی" شاکر نے کہا اور بات آئی گئی ہوگئی-

شام کے وقت شاکر گھر میں بیٹھا اپنے بھائی، زاہد، کے ساتھ لوڈو کھیل رہا تھا- زاہد پانچ سال کا تھا اور بڑا پیارا بچّہ تھا- امّی ابّو اپنے دونوں ہی بیٹوں سے پیار کرتے تھے، لیکن زاہد چھوٹا ہونے کی وجہ سے سب کا لاڈلا تھا- شاکر بھی زاہد سے بہُت محبّت کرتا تھا- اِس وقت جب کہ وہ دونوں لوڈو کھیل رہے تھے تو شاکر نے زاہد کی گوٹ کو پیٹ دیا- زاہد زور زور سے رونے لگا-

"آپ میری گوٹ پیٹتے ہیں- آپ گندے ہیں- اُوں اُوں اُوں" زاہد روتے ہوئے بولا-

"اچھا، لو، نہیں پیٹتا تمھاری گوٹ- چلو واپس رکھ لو" شاکر نے ہنستے ہوئے کہا-

"نہیں، آپ پھر میری گوٹ پیٹ دیں گے" زاہد نے کہا-

"اچھا، وعدہ رہا- میں تمھاری گوٹ نہیں پیٹوں گا" شاکر نے کہا-

زاہد کو اُس کی بات کا یقین نہ تھا- اُس نے ہاتھ مار کر ساری گوٹیں بکھیر دیں اور زور زور سے رونے لگا- شاکر نے اُسے پیار کیا، بِسکٹ دِلانے کا وعدہ کیا اور جب تک وہ چُپ نہ ہوا، چین سے نہ بیٹھا- وہ اپنے چھوٹے بھائی کو ہمیشہ خوش و خرّم دیکھنا چاہتا تھا- جب وہ اُسے لے کر باہر جاتا تو اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیتا اور بڑی اِحتیاط سے سڑک پار کراتا- اُسے ساری دُنیا میں زاہد سب سے زیادہ عزیز تھا- اُس کا وہی تو ایک بھائی تھا اور پھر اِتنا پیارا اور چھوٹا سا بھائی!!-

اب اِمتحان ہونے والے تھے- مسعود نہ تو خود پڑھائی پر توجّہ دیتا اور نہ شاکر کو پڑھنے دیتا- جب وہ کوئی مضمون لکھتا یا سبق یاد کرتا تو مسعود اُس سے باتیں شروع کر دیتا- شاکر اُس سے کہتا کہ وہ اِس وقت کام کر رہا ہے، وہ یہ باتیں پھر بھی کر لے- لیکن مسعود بڑا ڈھیٹ تھا- وہ اپنی کہے جاتا اور آخر کار شاکر پڑھائی چھوڑ کر اُس کے ساتھ باتوں میں لگ جاتا-

ایک دن اِسکول سے واپسی پر مسعود نے کہا "آؤ، نِشانہ لگائیں" یہ کہہ کر اُس نے ایک پتّھر اُٹھایا اور سڑک کے کنارے لگے ہوئے کھمبے کے بلب کی طرف پھینکا- پتّھر بلب کی بجائے کھمبے پر لگا- ٹن کی آواز آئی-

"اب تم نشانہ لگاؤ اور یہ بلب توڑ کے دکھاؤ" مسعود نے کہا-

"نہیں، بھئی- بلب ٹوٹ جائے گا تو گلی میں اندھیرا ہو جائے گا- لوگوں کو مشکل ہوگی"۔

"ارے، چھوڑو بھی- تمہیں لوگوں کی بڑی فِکر ہے"۔

مسعود نے کچھ اِس طرح کہا کہ شاکر اُس کی باتوں میں آگیا- اُس نے جو گھُما کے پتّھر پھینکا تو وہ سیدھا بلب پر لگا اور بلب ٹوٹ گیا-

"ارے واہ، میرے شیر! تم نے تو کمال ہی کر دیا!" مسعود نے خوش ہو کر کہا-

شاکر بھی مسکرا دیا- اُسے اِس بات کی خوشی ہوئی کہ اُس کا نِشانہ اچھا تھا- دونوں دوست ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے- کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا گٹر تھا- مسعود نے گٹر کو دیکھ کر کہا "پتا ہے، یہ جو گٹر کے ڈھکن ہوتے ہیں، اِنہیں نکال کر کباڑی کو دو تو وہ 30 روپے دیتا ہے"۔

"30 روپے؟" شاکر حیران ہو کر بولا-

"ہاں، پورے 30 روپے" مسعود نے کہا "میں نے ایسے کئی ڈھکن بیچے ہیں"۔

"اگر کوئی دیکھ لے تو؟"

"تم بھی پاگل ہو۔ ارے بُدّھو، رات کو جب گلی میں چہل پہل نہ ہو، تب اُٹھاتے ہیں" مسعود نے کہا۔

"اچھا سوچیں گے" شاکر نے کہا۔ وہ اِس خیال سے بہُت خوش ہوا کہ اگر مُفت میں 30 روپے مل جائیں تو خوب مزہ آئے گا۔

اگلے دن شام کو مسعود اور شاکر نے گٹر کا ڈھکّن اُٹھایا اور پھر ایک کباڑیے کے ہاتھ بیچ دیا۔ اُس نے 30 روپے دیے جو دونوں نے آدھے آدھے بانٹ لِیے۔ شاکر نے اپنے پیسوں سے ٹھنڈی بوتل پی، کیک اور پیسٹری کھائی۔ دو چار روپے جیب میں بچ رہے۔ اُس نے سوچا اِن پیسوں سے زاہد کے لِیے مٹھائی خرید لیتا ہوں۔ وہ مٹھائی لے کر گھر کی طرف چل دیا۔

"زاہد کہاں ہے؟ شام کو باہر گیا تھا۔ ابھی تک نہیں آیا" شاکر گھر گیا تو امّی نے پریشانی سے کہا۔

"یہیں کہیں ہو گا۔ میں جاکر دیکھتا ہوں" شاکر نے کہا اور باہر نکل گیا۔ اُس نے محلّے کے گھروں میں جاکر معلوم کیا لیکن زاہد وہاں نہیں تھا۔ گھر کے قریب کھیل کے میدان میں جاکر دیکھا تو وہاں سنّاٹا تھا۔ سب بچّے کھیل کُود کے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ وہ پریشان ہوگیا۔ زاہد تو گھر کے قریب ہی کھیلتا تھا۔ دُور نہیں جاتا تھا۔ پھر آج وہ کہاں چلا گیا؟ اُس نے اِردگِرد کے عِلاقے میں گھوم پھر کر اُسے تلاش کیا لیکن وہ کہیں نہ ملا۔ چلتے چلتے وہ اُس جگہ پہنچا جہاں گٹر تھا اور جس کا ڈھکّن اُس نے اور مسعود نے فروخت کیا تھا۔ اُس نے وہاں کھڑے ہوکر زور زور سے آوازیں دیں:

"زاہد! زاہد! تم کہاں ہو؟" اُس کی آواز خاموش فضا میں گونجنے لگی۔

اچانک اُس کے کانوں میں کسی کی سِسکیوں کی آواز آئی "کون ہے؟ یہ کون رو رہا ہے؟" شاکر نے زور سے پُوچھا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیکن کوئی بھی نظر نہ آیا۔

"مجھے نکالو! مجھے نکالو!!" کوئی بڑی درد بھری آواز میں پُکار رہا تھا۔

"تم کہاں ہو؟ جلدی بولو!" شاکر نے زور سے کہا اور پھر کھُلے ہوئے گٹر کے اندر جھانکا۔ وہاں مدّھم سی روشنی میں کوئی سفید سفید سی چیز دکھائی دی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ زاہد ہے۔ وہ حواس کھو بیٹھا "اُف! میرا بھائی گٹر میں گر گیا ہے۔"

"زاہد، پریشان مت ہو۔ میں ابھی تمہیں نکالتا ہوں۔ گھبراؤ مت" یہ کہ کر شاکر نے گٹر کے اندر ہاتھ ڈالا "تم میرا ہاتھ پکڑلو۔ میں تمہیں نکال لوں گا" اُس نے کہا۔ اُس کا دِل بُری طرح گھبرا رہا تھا۔ لیکن زاہد بہُت نیچے تھا۔ وہ ہاتھ نہیں پکڑ سکتا تھا۔

"بھائی جان! مجھے باہر نکالیں۔ مجھے باہر نکالیں۔ میرے پاؤں سے خون نکل رہا ہے۔ مجھے کسی جانور نے کاٹا ہے۔ اُف! میں مرجاؤں گا! لال بیگ میرے اُوپر چڑھ رہے ہیں" زاہد نے کراہتے ہوئے کہا۔

شاکر کا ہاتھ زاہد تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ وہ ابُّو کو بُلانے گیا۔ کئی لوگ اُن کی مدد کو آگئے۔ ٹارچ سے روشنی اندر ڈالی گئی۔ پھر بڑی مُشکلوں سے ایک آدمی اندر گیا اور زاہد کو باہر نکال لایا۔ لیکن اب زاہد زندہ نہ تھا۔ وہ مرچکا تھا!۔

شاکر کا صدمے سے بُرا حال تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ خود اپنے بھائی، اپنے پیارے بھائی، کی موت کا ذِمّے دار ہو گا۔ "کاش! میں نے گٹر کا ڈھکّن نہ اُٹھایا ہوتا۔ اے کاش! میں نے مسعود کی بات نہ مانی ہوتی۔ یہ میں نے کیا کیا؟ اُف میرے خُدا!۔ یہ کیا غضب کیا میں نے؟ اب میں زاہد کو کہاں سے لاؤں؟ میں لالچی ہوں۔ میں خود غرض ہوں۔ میں نے اپنے فائدے کے لِیے اپنے بھائی کی جان لے لی۔ میں قاتِل ہوں۔ میں مُجرِم ہوں" ایک بُرے دوست کی دوستی نے اُس جیسے نیک اور سیدھے سادے لڑکے کو مُجرِم بنا دیا تھا۔

اُزبکستان کی لوک کہانی

رِسراج نظامی

رِمیر کمال کا کمال

تاشقند اُزبکستان کا ایک مشہور تاریخی شہر ہے۔ یہی وہ شہر ہے جس میں 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد پاکستان اور بھارت نے امن کے مُعاہدے پر دستخط کیے تھے۔ مُدّت ہوئی اِسی شہر میں ایک آوارہ گرد فقیر رہتا تھا۔ اُس کا نام میر کمال تھا۔ وہ پرلے درجے کا کنجوس تھا اور اُسے چالاکی اور عیّاری میں بھی کمال حاصِل تھا۔ وہ اور اُس کی بیوی ضمیرہ ایک جھونپڑی میں رہتے تھے۔ اُن کے ہاں کوئی بچّہ نہ تھا۔ وہ بھیک مانگ کر گزُر بسر کرتا تھا۔ اُس کا اُصول تھا، نہ ہِینگ لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ چوکھا آئے۔

وہ سارا ہفتہ بڑے بڑے بازاروں کے چکّر کاٹتا اور رات کو کہیں سو جاتا۔ صرف بُدھ کے دن گھر جاتا تھا۔ ہفتے کے باقی چھ دن اُس کی بیوی جھونپڑی میں اکیلی رہتی تھی۔ ایک دن جب وہ گھر آیا تو بیوی نے رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ وہ چیخ چیخ کر کہنے لگی "تُو میرا خاوند ہے یا پتّھر کا بُت؟ میں سارا ہفتہ تیری اِس گندی جھونپڑی میں چُپ چاپ پڑی رہتی ہوں۔ کچھ دن اور یہی حالت رہی تو میں دیوانی ہو جاؤں گی۔ آخر میرے پاس کوئی تو ہو جس سے میں دل بہلا سکوں۔ ارے اور کچھ نہیں تو مجھے کوئی جانور ہی لا دے جو میری جھونپڑی میں بولتا رہے"۔

میر کمال کہنے لگا "بہت اچّھا"۔

اگلے بُدھ کو جب وہ گھر آیا تو اُس کے ساتھ ایک بھیڑ تھی۔ وہ بھیڑ اُس نے بیوی کے حوالے کر دی۔ ضمیرہ نے سمجھا کہ میں بڑی خوش قِسمت ہوں اور اب اُداس نہ رہوں گی۔ بھیڑ سارا سارا دن ممیاتی رہتی اور ضمیرہ اُس سے باتیں کرتی رہتی۔

لیکن ابھی تین دن بھی نہ گزُرنے پائے تھے کہ بھیڑ

جھونپڑی میں رکھی ہوئی ہر چیز چٹ کر گئی اور اِس کے باوجود بھوک کے مارے بلبلاتی اور ممیاتی رہی۔ بُدھ کو جب میر کمال گھر آیا تو ضمیرہ رو رو کر کہنے لگی "اب میں جان گئی ہوں کہ تم یہ بھیڑ کیوں لائے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ میں بھوکوں مر جاؤں۔ اگر خیر چاہتے ہو تو اِسے اِسی وقت لے جاؤ۔ نہیں تو میں اپنے میکے چلی جاؤں گی"۔

"نہیں، ضمیرہ - میکے مت جانا۔ میں ابھی اِس کا بندوبست کرتا ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ اپنے مرحُوم والِد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے قبرستان گیا۔ اُس نے قبرستان میں اُگی ہوئی لمبی لمبی عُمدہ گھاس دیکھی تو وہ دل میں کہنے لگا کہ یہ قبرستان میری بھیڑ کے لِیے جنّت سے کم نہیں۔ کیوں نہ اِسے یہاں چھوڑ دوں۔

گھر پہنچ کر اُس نے بھیڑ کو ساتھ لیا اور قبرستان میں لے آیا۔ پھر اُس نے وہاں کے گورکَن (قبر کھودنے والا) کی کوٹھڑی کے دروازے پر دستک دی۔ جب گورکَن باہر آیا تو میر کمال بڑے ادب سے بولا:

"السّلامُ علیکُم"۔

"وُ علیکُم السّلام۔ کہو بھئی، کیا بات ہے؟" گورکَن نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں، بھائی۔ بوڑھا ہو چکا ہوں۔ کوئی اولاد نہیں جو میری خبر گیری کرے۔ میری بس اِتنی اِلتجا ہے کہ جب مر جاؤں تو تم مجھے دفن کر دینا۔ میرے پاس روپیہ پیسہ نہیں جو میں تمہیں اِس کام کے لِیے دے سکوں۔ ہاں، یہ بھیڑ ہے۔ یہ میں تمہیں اُجرت کے طور پر پیشگی دے رہا ہوں۔ وعدہ کرو کہ تم مجھے دفن کر دو گے"۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ تُمہارے مرنے کے بعد قبر کھود کر تُمہیں دفن کر دُوں گا"۔

"اچھّا تو یہ رہی بھیڑ"۔ میر کمال نے بھیڑ اُسے دے دی۔

اِس بات کو دو ہفتے بیت گئے۔ ایک دِن میر کمال اپنے والِد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے قبرستان گیا تو وہ اپنی بھیڑ کو پہچان نہ سکا۔ وہ خوب موٹی تازی ہو گئی تھی۔ وہ دِل میں کہنے لگا "پتا نہیں ابھی میرے مرنے میں کتنے سال ہیں۔ میں ایسی موٹی تازی بھیڑ اِس گورکَن کو کیوں دوں"۔

اِتنے میں گورکَن آ گیا۔ میر کمال نے کہا "السّلامُ علیکُم"۔

"وُ علیکُم السّلام۔ کیا حال ہے؟" گورکَن نے پوچھا۔

"بہُت بُرا حال ہے۔ گاؤں کے ایک لڑکے کے خسرہ نکل آئی تھی۔ میں نے اُسے دوا دی تو وہ مر گیا۔ اب گاؤں والوں نے مجھے گاؤں سے نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اِس لِیے تم جلدی جلدی سامان باندھ لو اور میرے ساتھ چلنے کے لِیے تیّار ہو جاؤ!"

"سامان باندھوں اور تُمہارے ساتھ چلوں؟ کیا مطلب ہے تُمہارا؟" گورکَن نے پوچھا۔

"مطلب یہ ہے کہ تم بھی میرے ساتھ جاؤ گے۔ کیا تم نے مجھے دفن کرنے کا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا تم نے اُجرت کے طور پر یہ بھیڑ پیشگی نہیں لی تھی؟ میں جہاں بھی مرُوں، تم پر لازِم ہے کہ مجھے دفن کرو۔ اِس لِیے میں جہاں بھی جاؤں، تم بھی میرے ساتھ جاؤ گے"۔

"لعنت ہے اِس سودے پر! اپنی بھیڑ لے جاؤ، اور دُور ہو جاؤ میری نظروں سے!" گورکَن نے جھلّا کر کہا۔

میر کمال خوشی خوشی اپنی موٹی تازی بھیڑ لے کر گھر آ گیا۔ ضمیرہ اُسے دیکھ کر خوشی سے باغ باغ ہو گئی۔

ایک آدمی ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا تھا۔ اُس کی بیوی نے کہا کہ سوچنے کے لیے کوئی نوکر رکھ لیں، ورنہ آپ پاگل ہو جائیں گے۔ اُس آدمی نے نوکر رکھ لیا۔ نوکر نے پُوچھا "مجھے کیا کام کرنا ہو گا؟"

آدمی نے کہا "تمہیں سوچنا ہو گا"۔

نوکر نے پُوچھا "میری تنخواہ کتنی ہو گی؟"

آدمی نے کہا "پانچ ہزار روپے"۔

نوکر نے پُوچھا "آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟"

آدمی بولا "چار ہزار روپے"۔

نوکر نے کہا "تو پھر آپ مجھے پانچ ہزار روپے کہاں سے دیں گے؟"

آدمی بولا "یہی تو تمہیں سوچنا ہے"۔

(شاہد محمود کاشف، فتح پور)

ایک پروفیسر صاحب مکان کی چھت پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ اُن کی بیوی بھی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی کہ زور کی آندھی آئی اور مکان کی چھت کو اُڑا کر لے گئی۔ جب آندھی کا زور ٹُوٹا تو دونوں میاں بیوی ایک پارک میں گر پڑے۔

پروفیسر صاحب نے بیوی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کہا "روتی کیوں ہو؟ خدا کا شکر کرو کہ ہماری جان بچ گئی"۔

بیوی بولی "میں رو نہیں رہی۔ یہ تو خوشی کے آنسو

ہیں۔ آج ہم 30 برس بعد پہلی مرتبہ گھر سے اِکٹھے نکلے ہیں"۔ (مرزا غلام کاشف، فیصل آباد)

رُوبی اور فیصل پارک میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ سامنے سے ایک آدمی بھیڑیں لے کر گزرا۔

رُوبی نے کہا "مجھے اِن بے چاری بھیڑوں کو دیکھ کر بڑا دُکھ ہوتا ہے"۔

فیصل نے پُوچھا "کیوں؟"

"اِنہیں گرمیوں کے موسم میں بھی اُونی لباس پہننا پڑتا ہے" رُوبی نے جواب دیا۔ (رانی انعم احمد، پشاور)

پاکستان بننے کے بعد جب پہلی دفعہ سِکھ اپنے مُقدّس مقامات کی یاترا کے لیے بھارت سے لاہور آئے تو بے شُمار بچّے اُنہیں دیکھنے کے لیے گھروں سے نکل آئے، اور اُنہوں نے اُن کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

ایک سِکھ گھبرا کر بولا "بھائیو! گھیرا نہ ڈالو۔ دیکھتے جاؤ اور چلتے جاؤ۔ پیچھے بھی بہت سے بھائی ہمیں دیکھنے کے لیے کھڑے ہیں۔ اُن کا حق نہ مارو"۔ (ثنا اِرم، پشاور شہر)

اُستاد: بچّو، کوئی ایسا جان دار بتاؤ جس کے مُنہ میں دانت نہ ہوں۔

ایک بچّہ: سر، میرے دادا جان۔ (رانی انعم احمد، پشاور)

دو دوست جُوتے خرید رہے تھے کہ دُکان کے سامنے سے ایک بکری گزری۔ ایک دوست بکری کو دیکھ کر بولا "اگر انسان کی بھی چار ٹانگیں ہوتیں تو کیا ہوتا؟"

یہ سُن کر دُکان دار بولا "ہمارے جُوتے زیادہ فروخت ہوتے"۔ (وسیم مقصود کاشمیری، مِصری شاہ لاہور)۔

ماں (بیٹے سے): بیٹا، دیکھنا ذرا، ڈرائنگ روم میں کون رو رہا ہے۔

بیٹا: ابّو اپنے دوست کو گانا سُنا رہے ہیں۔ (غلام اکبر خٹک)

دوسرا رُخ

محمد فاروق انجم

آفتاب کا باپ کسی دفتر میں چپراسی تھا۔ معمولی تنخواہ تھی۔ اِس تنخواہ میں وہ بیوی بچّوں کا پیٹ ہی مُشکل سے پالتا تھا، بچّوں کو پڑھاتا لکھاتا کس طرح؟ چُناں چہ جب آفتاب 12 سال کا ہُوا تو اُس کے باپ نے اُسے موٹروں کی ایک ورکشاپ میں رکھوا دیا۔ اُس نے سوچا تھا کہ جب آفتاب کام سیکھ کر پورا مکینک بن جائے گا تو خوب پیسہ کمائے گا اور اُن کے دن پھر جائیں گے۔

آفتاب جس ورک شاپ میں کام کرتا تھا، اُس کا مالک، عالم بہُت بے رحم تھا۔ اُس کا لمبا تڑنگا جسم، لمبی لمبی مونچھیں اور بڑی بڑی سُرخ آنکھیں دیکھ کر جسم میں خوف کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ وہ بات بے بات اپنے مُلازموں کو ڈانتا ڈپٹا اور مارتا پیٹتا رہتا تھا۔ ہر مُلازم اُس کے ظلم سے پریشان تھا اور کوئی بھی اُس کی ورک شاپ میں کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر سبھی اُس سے ڈرتے تھے۔ کیوں کہ اُس کے تعلّقات بڑے لوگوں کے ساتھ تھے۔

ایک دن ورک شاپ کا ایک لڑکا، جمال، عالم کے ظُلموں سے تنگ آکر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ عالم نے اپنے آدمیوں کی مدد سے جمال کو دوسرے دن ہی ڈھونڈ نکالا اور ورک شاپ کے ملازموں کے سامنے اُس کی ایسی پٹائی کی کہ تمام ملازم سہم گئے اور اُنھوں نے بھاگنے کا خیال دل سے نکال دیا۔

آفتاب کے لیے وہ دن بہت بُرا تھا۔ اُس کے پیر کی ٹھوکر سے تیل کی بوتل اُلٹ گئی اور سارا تیل گر گیا۔ عالم کے منشی نذیر نے دیکھا تو فوراً عالم کو بتا دیا۔ پھر کیا تھا عالم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ آفتاب کو اِتنا مارا کہ اُس کے جسم پر نشان پڑ گئے۔

اسی دن آفتاب نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہ ورک شاپ چھوڑ دے گا۔ بلکہ یہ شہر ہی چھوڑ کر کسی دوسرے شہر چلا جائے گا اور ٹیلی فون کے ذریعے گھر اِطّلاع کر دے گا۔ یہ فیصلہ کر کے وہ ورک شاپ سے گھر جانے کی بجائے لاریوں کے اڈّے پر گیا اور قریب کے ایک شہر جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ بس کی رفتار تیز ہو گئی۔ سارے راستے اُس کی عجیب حالت رہی۔ اُسے اپنے گھر والے یاد آ رہے تھے۔ اور جب اُسے اپنی چھوٹی بہن یاد آئی تو اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اُس کی بہن ہر روز اُس کی واپسی پر گھر میں شور مچا کر اعلان کرتی تھی:

"بھائی آ گئے، بھائی آ گئے"۔

"آج وہ یہ اِعلان کرنے کی بجائے بھائی کا اِنتظار ہی کرتی رہے گی" آفتاب نے سوچا۔

اِن ہی سوچوں اور خیالات میں شہر آ گیا۔ بس سے اُترتے ہی اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک کال آفس سے ہمسایوں کے گھر فون کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی ماں آئی تو اُس نے ساری بات اُس کے گوش گزار کر دی۔ مگر وہ

کہاں سے بول رہا ہے؟ یہ نہ بتایا۔

وہ رات اُس نے مُسافِر خانے میں بسر کی اور صبح ناشتا کرنے کے بعد کام کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ آخر دوپہر کو وہ ایک ورک شاپ میں پہنچا۔ اِس ورک شاپ کا مالک 'دِل بر' بہُت شریف اور خدا ترس آدمی تھا۔ وہ اپنے مُلازموں کو اپنے بھائیوں کی طرح سمجھتا تھا۔ اُس کے تمام ملازم اُس سے خوش تھے اور خوب دل لگا کر کام کرتے تھے۔ اُس وقت دِلبر اپنے دفتر میں اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ سلام کرنے کے بعد آفتاب نے کہا "مجھے کام چاہیئے۔کیا مجھے یہاں کام مل جائے گا"؟

دلبر نے آفتاب کا جائزہ لیا اور پھر پوچھا "کام جانتے ہو؟"

"جی ہاں - بہُت چھوٹا تھا جب میں نے یہ کام سیکھنا شروع کیا تھا۔ اب تو میں مکینک بن گیا ہوں"۔

"کہاں کام کرتے تھے پہلے؟" دِلبر نے پوچھا۔

آفتاب نے ایک لمحے کے لِیے سوچا اور پھر سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ اُس نے اپنے گھر اِطّلاع دینے کی بات بھی بتا دی تھی۔

"مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی ہے کہ تم نے سچ بولا" دلبر نے کہا۔ "سچ بولنے والا اپنے دل پر کبھی کوئی بوجھ محسوس نہیں کرتا۔ میں عالم کو بہُت اچھّی طرح جانتا ہوں۔ بہرحال' تم میری ورک شاپ میں کام کر سکتے ہو۔ مجھے ایک مکینک کی ضرورت ہے۔ فی الحال تمھارے رہنے کا یہیں اِنتظام کر دیتا ہوں۔ تنخواہ کی بات تمھارا کام دیکھ کر کروں گا"۔

آفتاب بہُت خوش تھا کہ اُسے کام مل گیا ہے۔ اُس کے ماں باپ رات کو اُس کے گھر نہ آنے سے پریشان تھے مگر ٹیلی فون آتے ہی اُن کی پریشانی دور ہو گئی۔ لیکن اُنھیں اِس بات کی پریشانی تھی کہ آفتاب کہاں ہے اور اب کیا کر رہا ہے۔

دوسرے دن دس بجے عالم آفتاب کے گھر گیا تھا۔ آفتاب کا باپ کام پر چلا گیا تھا۔ گھر میں اُس کی ماں تھی۔ عالم نے اُس سے پوچھا "آفتاب آج کام پر کیوں نہیں آیا"؟

آفتاب کی ماں عالم کی سختیوں سے اچھّی طرح واقِف تھی۔ وہ بولی "ہم خود پریشان ہیں۔ وہ کل رات سے گھر نہیں آیا ہے"۔

"گھر نہیں آیا؟" عالم کے لہجے میں حیرت تھی۔

"پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے"۔

"واقعی چلا گیا ہے یا....."؟

"محلّے والوں سے پوچھ لیجیے۔ وہ یہاں نہیں آیا" آفتاب کی ماں نے کہا۔ عالم چند لمحے سوچتا رہا' پھر وہ چلا گیا۔

اُدھر آفتاب نے بہُت جلد دلبر کے دل میں جگہ بنا لی تھی۔ اُس کی ذہانت اور محنت دیکھ کر دلبر نے نہ صرف اُس کی تنخواہ بڑھا دی تھی بلکہ اُسے رہنے کے لِیے جگہ بھی دے دی تھی۔ اب آفتاب نے گھر فون کر کے ماں باپ کو سب کچھ بتا دیا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کام کرتا ہے۔ اُس کے ماں باپ یہ سُن کر کہ وہ ایک نیک اور خدا ترس آدمی کی ورک شاپ میں کام کر رہا ہے' بہُت خوش ہوئے۔

آفتاب کو دلبر کی ورک شاپ میں کام کرتے ہوئے تین چار مہینے ہوئے تھے کہ ایک دن دلبر کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا اور اُس کے بائیں بازو کی ہڈّی ٹوٹ گئی۔ اُسے ہڈّیوں کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ٹھیک اُسی دِن عالم بھی اُسی ہسپتال میں داخل ہوا۔ سیڑھیوں پر سے گرنے کی وجہ سے اُس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ اُس کے شہر میں ہڈّیوں کا ہسپتال نہ تھا۔ اِس لِیے اُسے اِس شہر میں آنا پڑا تھا۔

ہسپتال کے جنرل وارڈ میں دلبر اور عالم کے بستر ساتھ ساتھ تھے۔ دلبر کے سارے مُلازِم اُس کے لِیے دعا کرتے تھے۔ جب کہ عالم کی ٹانگ ٹوٹنے کا اُس کے کسی مُلازِم کو کوئی افسوس نہیں ہوا تھا اور کسی نے اُس کے لِیے دُعا نہیں کی تھی۔ یہ اُس کی سختیوں اور زیادتیوں کا ثمر تھا۔

دو دن گزر گئے تھے اور اِن دنوں میں دلبر کے تمام ملازم اپنے اُستاد کی خیریّت دریافت کرنے آئے تھے۔ دو تین ملازم تو ہر وقت اُس کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ آفتاب بھی اُسے دیکھنے آیا تھا مگر عالم کو برابر والے بیڈ پر لیٹا دیکھ کر وہیں سے واپس چلا گیا تھا۔ اُس کے ساتھیوں نے دلبر کو بتایا تو اُس نے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ ابھی اِس کا عالم کے سامنے آنا ٹھیک نہیں۔

عالم کی خیریّت دریافت کرنے کے لِیے صِرف اُس کا

منیجر ہی آتا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا کہ دل بر کی عیادت اور خدمت کے لیے تو اُس کے سبھی مُلازِم آرہے ہیں اور میرا ایک ملازم بھی نہیں آیا۔

ایک دن عالَم نے دِلبر سے کہا "ایک بات تو بتائیں"۔

"جی، پوچھیں"؟ دلبر بولا۔

"ہم دونوں کا کام ایک ہے۔ آپ کے بھی ملازم ہیں اور میرے بھی۔ ایک ہفتہ ہو گیا ہے ہمیں یہاں آئے ہوئے۔ کوئی دن نہیں جاتا جب آپ کا کوئی ملازم آپ کی خیریّت معلوم کرنے نہ آتا ہو۔ میرے ملازم میرے پاس کیوں نہیں آتے"؟

"ایک بات کہوں؟ ناراض تو نہیں ہوں گے"؟ دلبر نے مسکرا کر کہا۔

"کہیں۔ میں ناراض نہیں ہوں گا" عالَم کے لہجے میں نرمی تھی۔

"جب کسی ملک کا بادشاہ سخت اور ظالِم ہو تو رِعایا اُس کی سلامتی کی دُعا نہیں کرتی۔ جتنے زور سے گیند آپ دیوار پر ماریں گے، وہ اُتنے ہی زور سے واپس آئے گی۔ اِسی طرح جتنی محبّت اور پیار ہم دوسروں کو دیں گے، اُتنی ہی محبّت اور پیار وہ ہمیں دیں گے۔"

دلبر کی یہ بات عالَم کے دل میں اُتر گئی۔ جب وہ صحت یاب ہو کر اپنی ورک شاپ میں پہنچا تو اُس کے کسی ملازِم نے اُس کی طرف کوئی خاص توجّہ نہ کی۔ ہر ایک نے سرسری انداز میں اُس کی خیریّت دریافت کی تھی اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔

دوسرے دن عالَم نے سب مُلازموں کو اپنے دفتر میں بُلایا اور نرمی سے بولا "آج سے اِس ورک شاپ میں کسی کے ساتھ کوئی سختی نہیں ہو گی۔ کام پیار محبّت سے ہو گا۔ میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی پر بے جا سختی نہیں کروں گا۔ اب تک جو کچھ میں آپ کے ساتھ کرتا رہا ہوں، اُس کے لیے مُعافی چاہتا ہوں۔ اگر کوئی میری ورک شاپ میں کام کرنا نہیں چاہتا تو وہ اپنی تنخواہ لے کر جا سکتا ہے۔ اگر اُس نے ایڈوانس لیا ہے تو وہ میں مُعاف کرتا ہوں"۔

عالَم کا یہ دُوسرا رُخ دیکھ کر سب مُلازِم حیران رہ گئے۔ پھر سب نے ایک فیصلہ کیا اور عنایت سب ملازموں کی طرف سے بولا "اُستاد، ماضی میں جو کچھ ہوا، ہم اُسے بھول جائیں گے اور اب کہیں نہیں جائیں گے۔ آپ کی محبّت اور پیار کے سائے میں رہ کر محنت سے کام کریں گے"۔

اپنے ملازموں کے چہرے پر ایک نئی چمک دیکھ کر عالَم کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

نواب صاحب کی دعوت

ہر طرف دیگیں ہی دیگیں پک رہی تھیں۔ دیگوں میں چمچے کھڑک رہے تھے۔ چاروں طرف کھانوں کی خوش بو پھیلی ہوئی تھی۔ کسی کڑاہی میں مُرغے تلے جا رہے تھے تو کسی میں حلوا بن رہا تھا۔ دیگوں میں بریانی اور مُتنجن پک رہے تھے۔

ایسا لگتا تھا کہ کسی امیر آدمی کی شادی کا کھانا پک رہا ہے۔ مگر یہاں کسی کی شادی نہیں ہو رہی تھی۔ یہ تو نوّاب صاحِب کا شوق تھا۔ ہر سال موسِم بہار میں اس طرح کی دعوت کرنا اور اپنے عزیزوں، دوستوں اور شہر کے مشہور لوگوں کو کھانے پر بُلانا ان کا معمول تھا۔

نوّاب صاحِب صرف امیر آدمیوں کو ہی نہیں شہر کے معمولی اور غریب لوگوں کو بھی اس دعوت میں بُلایا کرتے تھے۔

نوّاب صاحِب یہ سب کچھ اپنی دولت مندی ظاہر کرنے کے لیے نہیں کرتے تھے۔ وہ تو بہُت نیک آدمی تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ شہر کے غریب لوگ بڑے بڑے سرکاری افسروں اور سیاست دانوں کے ساتھ مل بیٹھ سکیں اور اگر انھیں کوئی مسئلہ یا مشکل درپیش ہو تو وہ ان سے کھُل کر بات کریں۔

آج بھی نوّاب صاحِب کی حویلی میں ایک بہُت بڑی دعوت تھی۔ نوّاب صاحِب حویلی کے گیٹ پر مہمانوں کا اِستقبال کر رہے تھے اور ان کے مُلازِم مہمانوں کو اندر لے جا کر کرسیوں پر بٹھا رہے تھے۔

آخر حویلی کا صحن مہمانوں سے بھر گیا اور کھانے کا وقت ہوا تو نواب صاحِب نے مہمانوں سے کہا "خواتین و حضرات! بس چند منٹ بعد ہم کھانا شروع کرنے والے ہیں۔"

اچانک ایک موٹا سا آدمی اُٹھ کر کھڑا ہوا اور بولا "نوّاب صاحِب، کھانے سے پہلے میں ایک اعلان کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسا اِعلان"؟ نواب صاحِب نے حیرت سے کہا۔

"یہ اعلان اصل میں ایک چیلنج ہے۔ میں اس پوری محفل کو چیلنج کرتا ہوں کہ یہاں مجھ سے زیادہ کھانے والا کوئی آدمی ہو تو میدان میں آئے"۔

سب لوگوں کے چہروں پر دل چسپی کے آثار نظر آنے لگے۔

اُسی وقت ایک موٹا تازہ گراں ڈیل آدمی اُٹھ کر بولا "میں تمھارا چیلنج قبول کرتا ہوں۔ تم مجُھ سے زیادہ نہیں کھا سکتے۔ میں تو پورا بکرا کھا جاتا ہوں"۔

پہلے موٹے آدمی نے کہا "نواب صاحِب، اِس سے

پہلے کہ آپ مہمانوں کو کھانے کے لیے ہال میں جانے کے لیے کہیں، کیوں نہ ہم دونوں آپ سب کے سامنے اپنے کھانے کا مُقابلہ کریں"۔

"ہونا چاہیئے' ہونا چاہیئے" بہت سے لوگوں کی آوازیں گونج اُٹھیں۔

نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے بھئی۔ کرا لیتے ہیں مقابلہ" یہ کہہ کر انھوں نے اپنے ملازموں کو کہہ کر وہیں میز اور کرسیاں لگوا دیں۔ پھر بولے "آپ دونوں یہاں آجائیں اور بتائیں کہ آپ کے سامنے کیا چیز پیش کی جائے"؟

پہلے آدمی نے کہا "میرا خیال ہے کہ ایک ہی سائز کے چرغے ہمارے سامنے رکھے جائیں تاکہ یہ فیصلہ ہو سکے کہ کون زیادہ کھاتا ہے"۔

دوسرے موٹے آدمی نے کہا "ہاں' بالکل ٹھیک ہے۔"

نواب صاحب نے اپنے ملازموں سے کہا "اِن دونوں کے سامنے ایک ہی سائز کے آٹھ آٹھ چرغے رکھے جائیں"۔

اُسی وقت ان دونوں کے سامنے دو بڑی بڑی ڈشیں لا کر رکھ دی گئیں۔ ان دونوں میں آٹھ آٹھ چرغے تھے۔

دونوں نے کھانے کے لیئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ نواب صاحب کی آواز گونجی "ایک منٹ ٹھہرو!"۔

یہ کہہ کر انھوں نے اپنے گلے سے ایک ہار اُتارا اور بولے "یہ ہار پچاس ہزار روپے کا ہے۔ اِن دونوں میں سے جو کوئی بھی جیتے گا' میں اُسے یہ ہار انعام میں دوں گا"۔

یہ سُن کر سب مہمانوں نے تالیاں بجائیں۔

بس پھر کیا تھا' کھانے کا مُقابلہ شروع ہو گیا۔ سب کی نظریں ان دونوں پر جمی تھیں۔

چند منٹ بعد ہی دونوں چیں بول گئے۔

نواب صاحب نے کہا "بس کھا چکے؟ لیکن ابھی تو ڈشوں میں تین تین سالم چرغے موجود ہیں"۔

پہلے آدمی نے کہا "میں... میں تو بس پانچ ہی کھا سکا ہوں۔ اور نہیں کھا سکتا"۔

دوسرا آدمی بولا "اور... اور میں بھی پانچ ہی کھا سکا ہوں۔ میں چھٹے چرغے کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا"۔ یہ سُن کر سب مہمان ہنسنے لگے۔

نواب صاحب نے کہا "اس طرح تو کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کوشش کریں کہ چھٹا چرغہ بھی کھالیں۔ جس نے چھٹا چرغہ کھالیا' وہی جیت جائے گا"۔

ان دونوں نے چرغوں کی طرف ہاتھ بڑھائے مگر پھر ان کے ہاتھ رُک گئے۔ دونوں کے سر نفی میں ہلنے لگے۔

اُسی وقت ایک اور شخص کھڑا ہو گیا اور بولا "یہ دونوں تو بس خوامخواہ ہی کے دعوے کر رہے تھے۔ پانچ پانچ چرغوں سے ہی ان کے پیٹ بھر گئے ہیں۔ دیکھو' میں آپ کو پانچ سے زیادہ کھا کر دکھاتا ہوں"۔

نواب صاحب نے کہا "پہلے آپ کیوں نہیں اُٹھے تھے"؟

اُس نے کہا "مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ دونوں بس اِتنا سا ہی کھا سکیں گے۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ جو صاحب پورا بکرا کھانے کا دعویٰ کر رہے ہیں وہ سارے چرغے کھا جائیں گے۔"

نواب صاحب نے کہا "ٹھیک ہے۔ آپ بھی آجائیں"۔

وہ آدمی بھی آ کر ان دونوں کے ساتھ بیٹھ گیا اور لگا کھانے۔ اس وقت دونوں ڈشوں میں کل 6 چرغے تھے۔

چار ہی کھا کر اس آدمی کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ اس کی حالت دیکھ کر لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔ پھر اس نے پانچواں چرغہ بڑی مشکل سے کھایا اور گھُٹی گھُٹی آواز میں بولا "میں... میں بھی بس پانچ ہی کھا سکا ہوں"۔

اب ڈش میں صرف ایک چرغہ تھا۔

نواب صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "اب میں انعام کسے دوں"؟

ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا "یہ مُقابلہ چوں کہ برابر رہا ہے' اِس لیے آپ یہ ہار اپنے گلے میں ڈال لیں اور کھانا شروع کرائیں"۔

نواب صاحب نے کہا "نہیں۔یہ ہار میں اِنعام میں دینے کا اِعلان کر چکا ہوں۔ یہ تو اب کسی نہ کسی کو ضرور ملے گا۔ مگر کیسے؟ اِس بات کا فیصلہ آپ کریں"۔

اُسی وقت ایک دس بارہ سال کا بچّہ کھڑا ہوا اور چلّا کر بولا "نواب صاحب' تینوں آدمی پانچ پانچ چرغے ہی کھا سکے۔ اگر کوئی چھٹا چرغہ کھا جائے تو آپ اُسے یہ ہار اِنعام میں دے دیں گے"؟

نواب صاحب نے کہا "ہاں بالکل۔ جو چھٹا چرغہ کھا گیا' اِنعام اُسی کا"۔

بچّہ فوراً کھانے کی میز کی طرف لپکا اور جلدی جلدی آخری چرغہ کھانے لگا۔

نواب صاحب نے کہا "ارے! یہ کیا؟ تم تو خود ہی کھانے لگے"۔

بچّے نے لوگوں کی طرف مُنہ کر کے بلند آواز سے کہا "آپ سب گواہ رہیے۔نواب صاحب نے یہی کہا تھا کہ جو چھٹا چرغہ کھائے گا وہ اُسے اِنعام دیں گے۔ یہ دیکھیے چھٹا چرغہ میں کھا رہا ہوں"۔

نواب صاحب نے کہا "میں نے تو اِن تینوں کے بارے میں کہا تھا"۔

بچّے نے مہمانوں سے کہا "جناب' آپ بتایئے۔ کیا نواب صاحب نے یہ کہا تھا کہ اِن تینوں میں سے کوئی چ... چرغہ کھائے گا تو اُسے اِنعام ملے گا؟ اِنھوں نے تو یہی کہا کہ جو کوئی بھی اِس آخری چرغے کو کھائے گا' اُسے اِنعام ملے گا"۔

یہ سُن کر سب لوگ زور زور سے تالیاں بجانے لگے۔ نواب صاحب کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اُنھوں نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں یہ ہار اِس بچّے کو دیتا ہوں یہ اِس کی ذہانت کا اِنعام ہے"۔

پھر نواب صاحب نے مہمانوں سے کھانے کے لیے ہال میں جانے کی درخواست کی اور سب لوگ ہنستے مسکراتے ڈائننگ ہال کی طرف چل دیے۔

کونسی کشتی؟

اسلم، اکمل اور اکبر جھیل میں کشتیاں تیرا رہے تھے کہ کشتیوں کی رسّیاں آپس میں اُلجھ گئیں۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ کشتی A کی رسّی کس لڑکے کے ہاتھ میں ہے؟ پہلے خود کوشش کیجیے۔ اِس کے بعد جواب دیکھیے جو اِسی رسالے میں کسی جگہ دیا گیا ہے۔

حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ

لُقمان حکیم ایک بڑے دانا بزُرگ گزرے ہیں۔ کہتے ہیں آپ کا رنگ کالا تھا۔ کپڑے بھی سادہ پہنتے تھے۔ ایک بار کہیں جا رہے تھے کہ ایک امیر یہُودی سے آمنا سامنا ہو گیا۔ یہودی کا ایک غُلام اُنہی دنوں کہیں بھاگ گیا تھا۔ اُس نے لُقمان کو اپنا غلام سمجھا‘ لپک کر پکڑا‘ ساتھ لایا اور مکان بنانے پر لگا دیا۔ یہ بے چارے سال بھر کام کرتے رہے۔

جب مکان بن کر تیّار ہو گیا تو اِتّفاق سے اصلی غلام بھی مِل گیا۔ اب تو یہودی بہُت شرمندہ ہوا۔ اُس نے لُقمان سے مُعافی مانگی کہ مُجھ سے جو قصُور ہوا‘ نا سمجھی سے ہوا۔ خدا کے لِیے مُعاف کر دیجیے۔

لُقمان نے جواب دیا ”میں نے سال بھر جو محنت کی اور تکلیف اُٹھائی‘ وہ تمہارے مُعافی مانگنے سے پل بھر میں دُور تو نہ ہو گی‘ لیکن میں تمہیں مُعاف کرتا ہوں۔ ایک تو تمہارا کام ہو گیا‘ دوسرے مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ میں نے گھر بنانا سیکھ لیا۔ مجھے اِس گرفتاری سے ایک اور فائدہ بھی ہوا۔ میں نے محنت مزدوری کی تکلیف جھیلی ہے‘ اِس لِیے آیندہ اپنے نوکروں کے ساتھ سختی کا برتاؤ نہیں کروں گا‘ کیوں کہ مجھے اپنی تکلیف ہمیشہ یاد آتی رہے گی“۔

ایک کسان کا گدھا مر گیا۔ اُس نے گدھے کا سر کاٹ کر کھیت میں ایک بانس کے ساتھ باندھ دیا کہ فصل نظرِبد سے بچی رہے۔ ایک دانا نے دیکھ کر کہا ”بے چارہ گدھا جب تک جِیا‘ کسان کے ڈنڈے کھاتا رہا۔ اِتنا نہ ہوا کہ اپنی ہی جان بچالے۔ بھلا یہ مرنے کے بعد کھیت کو بُری نظروں سے کیسے بچائے گا۔ جو خود بے بس ہے‘ وہ دوسروں کی حفاظت کیسے کرے گا؟“

ایک دُکان دار دن بھر تو جُھوٹ بولتا‘ کم تولتا اور کم ناپتا‘ لیکن شام کو جب اُٹھتا تو شیطان پر لعنت بھیجتا۔

ایک دن شیطان نے تنگ آکر کہا ”اُستاد‘ اِس دو رنگی کے کیا معنیٰ؟ دن بھر تو شیطانی کام کرتے ہو اور میرے دوست بنے رہتے ہو‘ لیکن شام کو جب ڈھیر سارے پیسے کما لیتے ہو تو مُجھ پر لعنت بھیجتے ہو“۔

کسی مَیّت پر اُس کے رشتے دار اور دوست رو رہے تھے۔ ایک دانا نے دیکھا تو کہا ”مُردے کی زبان چلتی تو تُمھیں رونے سے روک دیتا اور کہتا کہ ہر آدمی کو جو دُنیا میں آیا ہے‘ ایک نہ ایک دن جانا ضرور ہے۔ تو میرے دو چار دن پہلے چلے جانے پر اِتنا روتے کیوں ہو؟ کیا تم ہمیشہ جیو گے‘ اور میں ہی ایسا بے بس تھا کہ مر گیا؟“

ع

کیا روتے ہو دُوسروں کو ‘ پیارو
مر جاؤ گے یُوں ہی خود بھی‘ یارو

دو آدمی آپس میں لڑ رہے تھے۔ یہ اُسے مارتا تھا‘ وہ اِسے پھٹکارتا تھا۔ ایک راہ چلتے بھلے مانَس نے دیکھا تو بیچ بچاؤ کرنے کو دونوں کے درمیان جا کھڑا ہوا۔ مگر لڑنے والوں میں سے ایک نے گھُونسا تان رکھا تھا اور دوسرے نے جُوتا۔ گھونسا بھلے مانَس کے مُنہ پر لگا اور جوتا سر پر۔ مُنہ سے خون بہنے لگا اور جُوتے کی چوٹ سے کھوپڑی پلپلی ہو گئی۔

ایک دانا نے یہ حال دیکھا تو کہا ”جو آدمی دوسروں کے مُعاملے میں دخل دیتا ہے‘ اُس کا یہی حال ہوتا ہے“۔

باتیں بڑوں کی

مرسلہ : محمّد طاہر لُقمان، ملتان

- شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ماں باپ کی نافرمانی ہے۔ (حضورِ پاکؐ)
- کھانے میں عیب نہ نکالو۔ اگر ناپسند ہو تو نہ کھاؤ۔ (حضورِ پاکؐ)

مرسلہ : رُقیہ حقّی، مارٹن روڈ کراچی

- بزرگوں کے آگے نہ چل۔ یہ بے ادبی ہے۔ (حکیم لُقمان)

مرسلہ : قرۃُ العین حیدر، اچھرہ لاہور

- پیڑ کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
  دونوں ہی کو امجدؔ ہم نے بچتے دیکھا کم
  ہنس پڑتا ہے بہت زیادہ غم پر بھی انسان
  بہت خوشی سے بھی تو آنکھیں ہو جاتی ہیں نم
  (امجد اسلام امجد)

مرسلہ : عُظمیٰ رُکن رٹی

- شیر خود نہیں کہتا کہ میں شیر ہوں۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ وہ شیر ہے۔ (مستنصر حُسین تارڑ)

مرسلہ : محمّد کامران قادر، شجاع آباد

- کام سے غلطی، غلطی سے تجربہ، تجربے سے عقل، عقل سے خیال اور خیال سے نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ (ایڈیسن)

مرسلہ : سُلطانِ عالم، کوئل ٹاؤن کوہاٹ

- جنگ کا یہ پہلو افسوس ناک ہے کہ لوگ مرجاتے ہیں۔ لیکن تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ ہم اُنہیں بُھلا دیتے ہیں جنھوں نے وطن کی آن پر جان دی، جب کہ اُن کا نام قوم کی آخری نسل تک زندہ رہنا چاہیے۔ (جنرل نیوی لوف)

مرسلہ : صائمہ اکرم، صادق آباد

- تین چیزیں انسان کو تباہ کر دیتی ہیں : لالچ، حسد اور غُرور۔ (امام غزالیؒ)
- اچھی کتاب سے اچھّا دوست کوئی نہیں۔ (فیثا غورث)
- دِل ایک آئینہ ہے۔ اگر وہ بُرائی سے پاک ہے تو اُس میں خدا بھی نظر آ سکتا ہے۔ (مولانا رومؒ)

(مرسلہ : ملک مہتاب عزیز، ڈیرہ اسماعیل خان)

- دُنیا کا کوئی شخص جاہل نہیں۔ ہر شخص سے کچھ نہ کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ (گیلیلو)

مرسلہ : رابعہ انصاری، فیڈرل بی ایریا کراچی

- ہر آدمی سے خوش اخلاقی سے پیش آؤ، لیکن بے تکلفی بہت کم لوگوں کے ساتھ رکھو۔ اور اِن بہت لوگوں پر بھی بھروسا کرنے سے پہلے اُنہیں اچھی طرح آزمالو۔ (جارج واشنگٹن)

مرسلہ : کیڈٹ ارسلان اعجاز انوار، حسن ابدال

- یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں
  کہ کام آئے دُنیا میں انساں کے انساں
- ادب ہی سے انسان، انسان ہے
  نہ سیکھے ادب جو، وہ حیوان ہے
  (مولانا حالی)

مرسلہ : امجد میاں داد، کوئٹہ

- امن اور چین درکار ہے تو آنکھ اور کان سے کام لو، اور زبان کو بند رکھو۔ (ہربرٹ اسپنسر)
- خدا ہر پرندے کو خوراک دیتا ہے۔ مگر اُس کے گھونسلے میں نہیں ڈالتا۔ (افلاطون)

مرسلہ : عرفان عامر طور، جہلم

- ☆ آسمان کا بہترین اور آخری تحفہ ماں ہے۔ (ہلٹن)
- ☆ اس بات سے ہمیشہ ڈرو کہ ماں بد دُعا کے لیے ہاتھ

اُٹھائے۔ (بُو علی سینا)

☆ دنیا کی سب سے حسین چیز ماں اور صرف ماں ہے۔ (محمدؐ علی جوہر)

☆ اگر مجھ سے ماں چھین لی جائے تو میں پاگل ہو جاؤں۔ (فردوسی)

مرسلہ : اِقرا صادق، ٹاؤن شپ لاہور

☆ اچھّی بات کہیں سے بھی ملے، پلّے باندھ لو، کیوں کہ جب کسی موتی کی قیمت معلوم کی جاتی ہے تو کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ اِسے سمندر کی تہ سے کس نے نکالا تھا۔ (سُقراط)

☆ دنیا میں سب سے مُشکِل کام اپنی اِصلاح ہے، اور سب سے آسان کام دوسروں پر نکتہ چینی کرنا۔ (اسپنسر)

☆ کسی کا دل مت دکھاؤ کہ تمہارے پہلو میں بھی دل ہے۔ (ٹالسٹائی)

☆ لوگ اچھّے ہوں تو قانون بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ (ڈِزرائیلی)

مرسلہ : حبیبُ اللہ بشیر، گُجرات

☆ بے شک دیر تک سوچو۔ مگر سوچنے کے بعد جو فیصلہ کرو، وہ اٹل ہو۔ (بنجمن فرینکلن)

☆ اگر تم ہنسو گے تو ساری دنیا تمہارے ساتھ ہنسے گی۔ اگر تم روؤ گے تو اکیلے ہی روؤ گے۔ (بیکن)

☆ دوست کی ناکامی پر رنجیدہ ہونا اِتنا دُشوار نہیں جتنا اُس کی کام یابی پر خوش ہونا مُشکِل ہے۔ (آسکر وائلڈ)

☆ وہ دل جس میں خلوص نہ ہو اُس سیپی کی مانند ہے جس میں موتی نہ ہو۔ (بائرن)

☆ جو جتنا زیادہ بولے، وہ اُتنا ہی کم عقل ہے۔ (خلیل جبران)

مرسلہ : ظفر اقبال اِسماعیلوی

☆ خون کی ندیاں بہانے سے وہ شُہرت حاصِل نہیں ہوتی جو ایک آنسو پونچھنے سے ہوتی ہے۔ (ایمرسن)

☆ مجھے اُس اِنسان پر رشک آتا ہے جو دولت اور زمین کے بغیر خوش رہتا ہے۔ (خوش حال خان خٹک)

مرسلہ : اِمتنانُ الرّحمٰن، فیصل آباد

☆ زمانے کے حادثوں اور آفتوں کو بُرا کہنا، خدا کو بُرا کہنا ہے۔ (اِمام غزالیؒ)

☆ زندگی میں تین چیزیں نہایت سخت ہیں : موت کا خوف، مرض کی تکلیف اور قرض کی ذِلّت۔ (بُو علی سینا)

☆ مصیبت کی شکایت سے پرہیز کرو۔ اِس سے خدا ناراض، دُشمن خوش اور دوست غم گین ہوتا ہے۔ (حضرت محمدؐ بِن حنیفہؒ)

مرسلہ : نعیم ارشد مرزا، سمن آباد لاہور

☆ بات کرنے سے پہلے سوچ لو، ورنہ بعد میں پچھتانا پڑے گا۔ (افلاطون)

☆ اِنسانیّت کا دوسرا نام مُحبّت ہے۔ (گوتم بُدھ)

مرسلہ : علی حسن رانا، پریم نگر لاہور

☆ عقل مند بولنے سے پہلے سوچتا ہے، اور بے وقوف بولنے کے بعد سوچتا ہے۔ (حضرت حسن بصریؒ)

☆ اچّھا دوست وہ ہے جو مصیبت میں کام آئے۔ (شیخ سعدیؒ)

☆ عِلم تلوار سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ (قائدِ اعظمؒ)

☆ قُرآنِ مجید کی تِلاوت ہی نہ کیا کرو، اِسے سمجھنے کی بھی کوشش کرو۔ (علاّمہ اِقبال)

آپ کی تحریر کیوں شائع نہیں ہوتی؟

اِس لیے کہ آپ ضروری باتوں کا خیال نہیں رکھتے۔ اگر اپنی تحریر شائع کروانا چاہتے ہیں تو ■ پہلے صفحے پر عنوان کے ساتھ پورا نام اور پتا درج کریں۔ ■ صاف ستھرا اور خوش خط لکھیں۔ ■ ایک سطر چھوڑ کے لکھیں۔ ■ پنسل سے نہ لکھیں۔ ■ اپنی تمام تحریریں الگ الگ کاغذ پر لکھیں۔ ■ کوپن تصویر یا معمے کے ساتھ پن اپ کریں۔ بلا عنوان، آپ بھی پوچھیے، آئیے دوست بنائیں، آئیے مسکرائیں، ساتھی ایک ہی لفافے میں بھیج سکتے ہیں۔ آپ بھی لکھیے (ننھے ادیب) اور آپ کا خط ملا، ایک لفافے میں اور دلدوزی علمی معما الگ لفافے میں۔ سب لفافوں پر اُن کے شعبوں کا نام لکھ کر ارسال کریں۔ اپنی تحریریں ساتھی اِس پتے پر ارسال کر سکتے ہیں۔ ایڈیٹر ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ بن بادیس (ایمپریس) روڈ لاہور۔

دُرُود شریف

ذیشان علی سلیم، راولپنڈی

ہماری نانی بہت پرہیزگار عورت ہیں۔ وہ خود بھی نیک کام کرتی ہیں اور مجھے اور میرے بہن بھائیوں کو بھی نیک کام کرنے کی ہدایت کرتی ہیں۔ ہم سب اُنہیں بہت چاہتے ہیں۔ وہ بھی ہمیں بہت چاہتی ہیں اور ہماری بہتری کے لیے ہر وقت دُعا کرتی ہیں۔

نانی ہمارے ماموں کے پاس لاہور میں رہتی ہیں اور ہم راول پنڈی میں رہتے ہیں۔ وہ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمارے گھر آتی ہیں اور جاتے وقت کوئی نہ کوئی اچھی بات ہمیں سکھا جاتی ہیں۔ مثلاً اُنہی کے کہنے پر ہم پانچ وقت کے نمازی بن گئے ہیں اور اُنہوں نے ہمیں کئی دُعائیں بھی یاد کرا دی ہیں۔

پچھلے سال گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو ہمیں چھٹیوں سے زیادہ اپنی نانی کی آمد کی خوشی تھی۔ ہم نے چھٹیوں کے شروع ہی میں ماموں کے گھر فون کیا اور نانی سے کہا کہ وہ جلد سے جلد ہمارے گھر آ جائیں۔ چناں چہ وہ سات آٹھ دن بعد آ گئیں۔ ہم سارے بہن بھائی اُن سے لپٹ گئے اور پیار لینے کے بعد اُن کو اپنے کمرے میں لے گئے۔ اُنہوں نے سب سے پہلے ہم سے پوچھا ”بچّو، آپ میں سے کون بلاناغہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہے؟“

میں اور میری بہن بولے ”نانی جان، ہم پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں“۔ یہ سُن کر وہ بہت خوش ہوئیں اور ہمیں ایک ایک گھڑی اِنعام میں دی۔

رات کو کھانے کے بعد ہم نے نانی کے ساتھ نماز پڑھی اور پھر جلدی جلدی دُعا مانگی تاکہ اُن سے اچھی اچھی باتیں سُن سکیں۔ لیکن وہ دُعا مانگ کر درود شریف کا وِرد کرنے لگیں۔ ہم بڑی بے چینی سے اُن کا اِنتظار کر رہے تھے۔ اُنہیں ہماری حالت کا پوری طرح عِلم تھا۔ لیکن اُنہوں نے پوری عبادت کی اور جب لیٹیں تو ہمیں بتانے لگیں ”بچّو، مجھے پتا ہے کہ تم مجھے دُرُود پاک پڑھتے دیکھ کر بہت بے چین تھے۔ دراصل درود پاک کی بڑی فضیلت ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ فرماتے تھے کہ جو مُجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے، اللہ اُس کی دس نیکیاں بڑھاتا ہے اور اُس کے دس درجے بلند کرتا ہے۔ تو پھر بچّو، تم خود سوچو کہ جو بندہ کثرت سے درود شریف پڑھے، اُس کو کتنا ثواب ہوتا ہو گا“۔ یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر چُپ رہیں اور پھر ہمیں یہ واقِعہ سُنایا۔

”ایک بُزرگ کا ہمسایہ بہت بُرا تھا۔ وہ بُزرگ اُس کو بہت سمجھاتے لیکن وہ سیدھے راستے پر نہ آتا۔ جب وہ مر گیا تو بُزرگ نے خواب میں دیکھا کہ اُن کا وہ ہمسایہ جنّت میں ہے۔ بُزرگ نے اُس کے جنّت میں جانے کی وجہ دریافت کی تو وہ کہنے لگا کہ میں نے مِیلاد کی ایک مجلس میں بلند آواز سے، سب حاضرین کے ساتھ، درود شریف پڑھا تھا۔ اللہ نے ہم سب کو بخش دیا“۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ نانی نے بات چھوٹی کرتے ہوئے کہا ”بچّو، مجھے یقین ہے کہ تم پر اِس واقعے کا بہت اثر ہوا ہو گا اور اب تم بھی کثرت سے درود شریف

پڑھو گے"۔

نانی کو گئے کئی مہینے گزر گئے ہیں مگر اُن کی باتیں میرے دل میں گھر کر گئی ہیں اور میں ہر روز زیادہ سے زیادہ درود پاک پڑھتا ہوں۔

(پہلا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

اپریل فول

محمد طارق خان، افشاں کالونی راول پنڈی

یکم اپریل کا دن تھا اور ذی شان اور کاشان بڑی دیر سے اپنے کمرے میں بیٹھے اپریل فول کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ ذی شان بولا "اس دفعہ تو کوئی مزے دار قسم کا مذاق ہونا چاہیے"۔

"ہاں۔ ڈبّے میں مٹھائی کی جگہ پتھر بھرنا یا نقلی نوٹ دھاگے سے باندھنا تو اب پُرانی بات ہوگئی ہے" کاشان بولا۔ دونوں پھر سے سوچنے لگتے ہیں۔

"ارے آگیا! ونڈر فل آئیڈیا!" ذی شان بولا "کیوں نہ اِس دفعہ ہم اپنے اِغوا کا ڈراما رچائیں؟" ذی شان بولا۔

"وہ کس طرح؟" کاشان نے حیرت سے پُوچھا۔

"ہم کہیں باہر جا کر گھر فون کرتے ہیں کہ آپ کے دونوں بیٹے ہمارے قبضے میں ہیں" ذی شان نے کہا۔

"مگر فون پر آواز پہچان لیے جانے کا خطرہ ہے اور.... ارے ہاں، کیوں نہ ہم اسلم کے گھر چلیں؟ اُس کی آواز بھی بھاری ہے اور اُس کو ہمارے گھر والے بھی نہیں جانتے" کاشان نے تجویز پیش کی۔

ٹھیک ہے۔ آؤ، چلیں" ذی شان نے کہا۔

وہ دونوں جڑواں بھائی تھے اور اُن کے والد، فُرقان صاحب، گورنمنٹ کے ایک محکمے میں افسر تھے۔ اُنھوں نے اسلم کے گھر جا کر اُسے اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا تو وہ یہ انوکھا آئیڈیا سُن کر اُچھل پڑا۔

فُرقان صاحب دفتر سے گھر پہنچے تو گھر میں خلافِ معمول خاموشی دیکھ کر بیگم سے پُوچھا "بھئی، یہ بچے کدھر ہیں؟" اُن کی بیگم نے جواب دینے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ بیگم نے ریسیور اُٹھایا "ہیلو! بیگم فرقان بول رہی ہوں۔ ہیں! کیا کہا؟" انھوں نے چیخ ماری، ریسیور اُن کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ صوفے پر ڈھیر ہو گئیں۔

فُرقان صاحب نے جھپٹ کر ریسیور اُٹھایا اور بولے "ہیلو! ہیلو!"

"مسٹر فُرقان بول رہے ہیں کیا؟" دوسری طرف سے ایک بھاری سی آواز سُنائی دی۔

"ہاں، میں ہی بول رہا ہوں" فُرقان صاحب جلدی سے بولے۔

"مسٹر فرقان! ذرا توجّہ سے سُنیے۔ آپ کے دونوں بیٹے ہمارے قبضے میں ہیں۔ اُن کی خیریّت چاہتے ہیں تو فوراً پانچ لاکھ روپوں کا بندوبست کیجیے۔ اور ہاں، پولیس کو بُلانے کی ضرورت نہیں، ورنہ......"

"کون ہو تم، اور کہاں سے بول رہے ہو؟" فُرقان صاحب دہاڑے۔

"میں دس منٹ بعد فون کروں گا" دوسری طرف سے آواز آئی اور اِس کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی۔

دس منٹ بعد ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجی۔ فُرقان صاحب نے لپک کر ریسیور اُٹھایا۔

"آپ نے اچھا کیا کہ پولیس کو فون نہیں کیا" دوسری طرف سے وہی بھاری سی آواز سُنائی دی۔

"سُنو! تم کون ہو، اور کیا مُطالبہ ہے تمہارا؟" فرقان صاحب نے پوچھا۔

"صرف پانچ لاکھ روپے۔ بچّوں کی زندگی چاہتے ہو تو پولیس کو نہ بتانا۔ مجھے تمہاری ایک ایک پل کی خبر ہے۔ پیسے لے کر اپنے بچّوں کے اِسکول کے سامنے پہنچ جاؤ۔ جلدی۔ فوراً" دوسری طرف سے کہا گیا اور لائن کٹ گئی۔

آدھ گھنٹے بعد ذی شان نے کہا کہ اب اِسکول چلنا چاہیے۔ اسلم بھی اُن کے ساتھ ہولیا۔ تینوں اِسکول کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ کچھ دیر بعد اُنھیں ابّو کی کار دکھائی دی۔ وہ

اکیلے آ رہے تھے۔ جب وہ اِسکول کے سامنے پہنچے تو اُنھوں نے ذی شان اور کاشان کو اپنے ایک ہم عُمر لڑکے کے ساتھ گیٹ کے سامنے کھڑے دیکھا۔ اُنھیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ لپک کر اُن کے پاس پہنچے تو تینوں چلّاکر بولے "اپریل فول!"

آدھ گھنٹے بعد، فُرقان صاحب کے گھر کے صحن میں ذی شان، کاشان اور اسلم سر جُھکائے کھڑے تھے اور فرقان صاحِب نہایت غُصّے میں اُن کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ وہ گرج کر بولے "تمھیں کچھ اندازہ ہے کہ تمھارے اِس خطرناک مذاق نے ہمیں کتنا پریشان کیا؟ تمھاری امّی ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں۔ اُنھیں کچھ ہو جاتا تو؟ مذاق کی بھی کوئی حد ہوتی ہے"۔

"سوری، ابّو" ذی شان اور کاشان بولے۔

"سوری، انکل۔ ہمیں مُعاف کر دیجیے" اسلم بولا۔

"ہُوں۔ سوری سوری سے کام نہیں چلے گا۔ تم تینوں کی ہلکی سے ہلکی سزا یہ ہے کہ تم سو سو ڈنڈ نکالو۔ چلو، شروع ہو جاؤ۔ ابھی اور اِسی وقت" یہ کہ کر فُرقان صاحِب کُرسی پر بیٹھ گئے اور وہ تینوں ڈنڈ بیٹھکیں نکالنے لگے۔ اِس کے سِوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ (دوسرا اِنعام: 45 روپے کی کتابیں)

اصل دُشمنی

محمّد داؤد ایّوب، پشاور

نوید آج بہُت خوش خوش اِسکول جا رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ آج انگلش کا ٹیسٹ تھا اور اُس نے خوب تیّاری کی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ ٹیسٹ میں پاس ہو جائے گا۔

نوید ایک لائق لڑکا تھا۔ مگر اُس کا ایک دوست اصغر بہُت نالائق تھا۔ وہ ہر دفعہ نقل کے ذریعے پاس ہوتا۔ نوید اور اصغر کی دوستی اِسی وجہ سے ہوئی تھی کہ نوید اصغر کو نقل کراتا تھا۔ اِس دفعہ بھی اصغر نے تیّاری نہیں کی تھی، کیوں کہ اُسے نوید پر بھروسا تھا۔

نوید اِسکول پہنچا۔ اسمبلی ہوئی۔ اسمبلی کے بعد انگلش کے اُستاد آئے۔ اُنھوں نے لڑکوں سے کہا "آپ میں ایسے لڑکے بھی ہیں جو دوسرے لڑکوں کو نقل کراتے ہیں۔ جب ایک لڑکا دوسرے لڑکے کو نقل کراتا ہے تو وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اُس کے ساتھ دوستی کر رہا ہے۔ لیکن یہ دوستی نہیں دُشمنی ہے جو آگے چل کر نقل کرنے والے کی ترقّی کی راہ میں رُکاوٹ بنتی ہے"۔

پرچہ شروع ہُوا تو اصغر نے نوید سے کہا "یہ پہلا سوال تم نے کس طرح حل کیا ہے؟ مجھے دکھاؤ۔" نوید نے اصغر کی بات اَن سُنی کر دی اور خاموشی سے پرچہ کرتا رہا۔ اصغر بار بار اُس سے پوچھتا رہا لیکن اُس نے اپنا پرچہ اُسے نہیں دکھایا۔ اُس کے ذِہن میں اُستاد صاحِب کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اُدھر اصغر آوازوں پر آوازیں دیے جا رہا تھا۔ لیکن نوید نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اُسے نقل نہیں کرائے گا۔ وہ اُس کے ساتھ اِتنی بڑی دُشمنی نہیں کر سکتا۔

ٹیسٹ ختم ہونے کے بعد نوید باہر نکلا تو اُس نے اصغر سے کہا "دیکھو، اصغر......." لیکن اصغر نے اُس کی بات کاٹ دی اور جھڑک کر بولا "مت بولو میرے ساتھ۔ آج سے میری تمھاری دوستی ختم"۔

نوید سارا دن سوچتا رہا کہ وہ اصغر کو کیسے سمجھائے۔ آخر وہ اصغر کے گھر گیا اور اُس کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ اصغر باہر نکلا اور جوُں ہی نوید کو دیکھا، واپس جانے کے لیے مُڑا۔ لیکن نوید نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور کہا "میں تمھارے ساتھ دُشمنی نہیں کر سکتا۔ اگر تم نے خود محنت نہیں کی اور تم نقل کے ذریعے پاس ہوتے رہے تو تم کبھی ترقّی نہیں کرسکوگے"۔

یہ باتیں سُن کر اصغر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ نوید کے گلے لگ گیا اور بولا "آج کے بعد میں خوب محنت کروں گا اور اپنی محنت سے اِن شاء اللہ پاس ہوں گا۔ (تیسرا اِنعام: 40 روپے کی کتابیں)۔

غلط سوچ

انوار آس محمّد، کراچی

رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ انعم کے امّی، ابّو اور

چھوٹا بھائی جُنید سب گہری نیند سو چکے تھے۔ لیکن انعم اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی زار و قطار رو رہی تھی۔

بات دراصل یہ تھی کہ اُس دن انعم اپنی امّی کے ساتھ بازار گئی تھی۔ امّی کو ننّھے جُنید کے لیے ایک بستہ خریدنا تھا۔ بُک شاپ پر انعم نے شوکیس میں رکھی ہوئی ایک خوب صورت پنسل دیکھی تو امّی سے کہا کہ مجھے یہ پنسل لے دیں۔ لیکن امّی نے اُسے جھڑک دیا تھا اور کہا تھا کہ تمھیں تو ہر دو دن بعد پنسل چاہیے۔ امّی کی یہ بات سُن کر انعم کے ذِہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اُس کی امّی جُنید سے زیادہ پیار کرتی ہیں اور اُس سے کم۔

آخر روتے روتے رات کے کسی پہر اُس کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند سو گئی۔

"اُٹھو، انعم۔ اِسکول نہیں جانا؟" صبح کو امّی نے اُسے جگایا۔

انعم رات کو دیر سے سوئی تھی اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اُس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ جیسے تیسے جمائیاں لیتے ہوئے اُٹھی اور اِسکول جانے کی تیّاری کرنے لگی۔ جب وہ تیّار ہو گئی تو امّی نے اُسے ناشتا دیا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد وہ کندھے پر بستہ لٹکا کر گھر سے نکلنے ہی والی تھی کہ امّی نے کہا "ٹھہرو، انعم۔ وہ پنسل تو لیتی جاؤ جو کل تم نے پسند کی تھی۔ میں کل تمھیں دینا بھول گئی تھی"۔

یہ کہہ کر امّی اپنے بیڈ روم میں گئیں اور پنسل لا کر انعم کو دے دی۔ پھر انھوں نے پیار کر کے اُسے رُخصت کیا۔

پنسل پا کر انعم خوشی سے کِھل اُٹھی اور خوشی خوشی اسکول روانہ ہو گئی۔ اب کسی قسم کی غلط سوچ اُس کے ذِہن میں نہیں تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ امّی اُسے بھی جُنید جِتنا پیار کرتی ہیں۔ (چوتھا اِنعام: 35 روپے کی کتابیں)۔

سُورت بقرہ کی فضیلت

ناصِر خان مندوخیل، کوئٹہ

یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

ہماری ایک مِس ہمیں اسلامیات پڑھاتی تھیں، اور جب وہ سبق پڑھا چُکتیں اور ابھی گھنٹی بجنے میں کچھ دیر ہوتی تو وہ ہمیں انبیاءِ کِرامؑ کے حالات سُناتی تھیں۔ ایک دن اُنھوں نے ہمیں سُورت بقرہ کی فضیلت کے بارے میں بتایا۔

اسید بن حضیرؓ فرماتے ہیں کہ میں رات کو نفلوں میں سُورت بقرہ پڑھ رہا تھا۔ میرا گھوڑا میرے قریب بندھا ہوا تھا اور گھوڑے کے قریب میرا بیٹا یحییٰ سو رہا تھا کہ یکایک گھوڑا اُچھلنے کُودنے لگا۔ میں پڑھتے پڑھتے خاموش ہو گیا تو گھوڑا بھی اپنی جگہ خاموش کھڑا ہو گیا۔

میں نے دوبارہ سُورت بقرہ پڑھنا شروع کی تو گھوڑا پھر اُچھلنے کودنے لگا۔ میں خاموش ہوا تو گھوڑا بھی چُپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ میں نے پھر پڑھنا شروع کیا تو گھوڑے نے پھر شوخی شروع کر دی۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں گھوڑا بچّے کو کُچل نہ ڈالے۔

میں بچّے کو اُٹھانے کے لیے آگے بڑھا تو میری نظر آسمان پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ آسمان پر ابر چھایا ہوا ہے اور ابر میں چراغ جل رہے ہیں۔ لیکن جب میں باہر نکل کر گیا تو کچھ بھی نہ تھا۔

میں نے صبح کو یہ واقعہ حضور ﷺ سے عرض کیا تو آپؐ نے فرمایا "اے اسیدؓ، تو خاموش کیوں ہو گیا؟ قرآن پڑھتا رہتا۔ اے اسیدؓ، تو کیوں رُک گیا؟ برابر پڑھتا رہتا"۔

میں نے عرض کیا "یا رسولَ اللہؐ! میرا بیٹا یحییٰ گھوڑے کے قریب سو رہا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہیں اُسے گھوڑا کُچل نہ دے"۔

حضورؐ نے اِرشاد فرمایا "اے اسیدؓ، تو جانتا ہے وہ کیا شے تھی؟"

میں نے عرض کیا "جی نہیں"۔ آپؐ نے فرمایا "وہ فرشتے تھے جو تیری قرأت سُننے آئے تھے۔ اگر تو برابر پڑھتا رہتا تو صبح کو تمام لوگ اُنھیں دیکھتے اور وہ اُن کی نظروں

سے نہ چھپتے۔ (پانچواں انعام: 30 روپے کی کتابیں)

سچی ہمدردی

محمد سلیم اعوان، پوٹہ ضلع ڈیرہ اسماعیل خان

"امی جان، مجھے سو روپے دے دیں۔ مجھے فٹ بال خریدنا ہے" امجد نے اپنی امی سے کہا۔

"بیٹے، اِس وقت تو میرے پاس اِتنی رقم نہیں ہے۔ شام کو تمہارے ابو دفتر سے آئیں گے تو اُن سے لے دوں گی۔ امی نے امجد کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

امجد اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ وہ جو کچھ کہتا، مان لیا جاتا۔ لیکن وہ ضدی نہیں تھا۔ اگر اُسے کوئی چیز نہ ملتی تو وہ ضد کی بجائے صبر کرتا۔

آج چھٹی کا دن تھا۔ دوستوں نے اُس سے کہا کہ تم اپنے پاس سے ایک فٹ بال خرید لاؤ۔ ہم بعد میں تمہیں پیسے دے دیں گے۔ امجد دوستوں کے کہنے پر گھر گیا اور امی سے بات کر کے دوستوں کو بتایا کہ شام کو وہ ابو سے رقم لے کر فٹ بال خرید لے گا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ گھر واپس آ رہا تھا تو اپنے پڑوسی نذیر کے گھر کے سامنے اُس نے لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ قریب پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ نذیر کا کسی آدمی کے ساتھ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا اور وہ آدمی نذیر کو دھمکیاں دے کر چلا گیا تھا۔

جب لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے تو امجد نے نذیر کے گھر کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک شخص جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرہ مُرجھایا ہوا تھا، میلے کچیلے کپڑے پہنے باہر آیا اور مریل سی آواز میں پوچھا "کیا بات ہے، بیٹے؟ تم نے دروازہ کھٹ کھٹایا تھا؟"

امجد نے اُس سے جھگڑے کے متعلق پوچھا تو وہ اُسے گھر کے اندر لے گیا۔ اُس کے کوئی بیوی بچے نہ تھے۔ وہ اکیلا رہتا تھا۔ ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر بٹھانے کے بعد اُس نے امجد کو بتایا کہ وہ آدمی جو یہاں آیا تھا، دُکان دار ہے اور میں اُس سے سودا سُلف لیتا ہوں۔ پچھلے ایک ماہ سے میں بیمار ہوں اور محنت مزدوری کے قابل نہیں۔ اِس لیے اُس کا ایک ماہ کا اُدھار ادا نہ کر سکا۔ آج وہ رقم لینے آیا تھا اور یہ دھمکی دے گیا ہے کہ اگر شام تک میں نے اُسے 100 روپے نہ دیے تو وہ میرے گھر کا سامان اُٹھا کر لے جائے گا۔ یہ کہہ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

امجد کو یہ سُن کر بہت دُکھ ہوا اور اُس نے اپنے غریب پڑوسی کی مدد کرنے کا پُختہ اِرادہ کر لیا۔ اُس نے نذیر سے کہا کہ آپ فِکر نہ کریں۔ میں شام تک آپ کو 100 روپے دے دوں گا۔ آپ اب آرام کریں۔

وہ وہاں سے سیدھا گھر آیا اور کھانا کھا کر اپنے ابو کا بے چینی سے اِنتظار کرنے لگا۔ شام کو ابو آئے تو اُس نے اُن سے رقم لی اور فٹ بال خریدنے کی بجائے سیدھا نذیر کے گھر پہنچا اور سو کا نوٹ اُسے دے دیا۔

نذیر بولا "بیٹے، میں تمہارا یہ اِحسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ اِن شاء اللہ صحت یاب ہونے کے بعد سب سے پہلے تمہیں یہ رقم واپس کروں گا"۔

امجد نے جواب دیا "چچا، میں نے یہ رقم واپس لینے کے لیے نہیں دی۔ یہ کوئی قرضہ نہیں ہے"۔

نذیر کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل پڑے۔ اُس نے آگے بڑھ کر امجد کا ماتھا چُوم لیا۔ امجد خوشی خوشی گھر گیا۔ آج وہ بہت خوش تھا کیوں کہ اُس نے ایک دُکھی اِنسان کی بغیر کسی لالچ کے مدد کی تھی۔ اُس کے ابو نے خوشی کی وجہ پُوچھی تو اُس نے اُنہیں سارا واقعہ سُنا دیا۔ ابو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ وہ نذیر کو کل ہسپتال میں داخل کروا دیں گے اور اُس کے لیے نوکری کا بندوبست بھی کر دیں گے۔

(چھٹا اِنعام: 25 روپے کی کتابیں)

اللہ کی نعمت

صحت ہے اللہ کی نعمت
لازم ہے صحت کی حفاظت

صحت ہے تو ذہن ہے اچھا
ورنہ مشکل لکھنا پڑھنا

صحت دولت، صحت عزت
ہو جو نہ صحت، پھر ہے دقت

صحت ہے تو دنیا جنت
بچو، کم زوری ہے ذلت

صحت کے دم سے خوش حالی
صحت کھیتوں کی ہریالی

صحت ہنستا بستا گلشن
صحت کی ہے گندگی دشمن

اس سے ضیا دنیا یہ حسیں ہے
گر نہ ہو صحت، کچھ بھی نہیں ہے

ضیاء الحسن ضیا

نیپال کے جنگل میں

سلیم خاں گمی

میرے والد مچھلیوں کے شکاری تھے۔ ان کے پاس مچھلیاں پکڑنے کا سرکاری اجازت نامہ بھی تھا جسے انگریزی میں لائسنس کہا جاتا ہے۔ جب میں چار سال کا ہوا تو انہوں نے میرے لیے بھی مچھلیاں پکڑنے کا لائسنس بنوالیا۔ یہ ان کا شوق تھا ورنہ چار سال کا بچّہ مچھلیاں کیوں کر پکڑ سکتا ہے؟

دراصل میرے والد کی خواہش تھی کہ میں بڑا ہو کر مچھلیوں کا شکاری بنوں۔ پہلے گاؤں کے جوہڑ میں مچھلیاں پکڑوں، پھر گاؤں کے قریب بہنے والی ندی میں جال ڈالوں اور اِس کے بعد بڑے دریا میں۔

وہ جمعے کو مچھلیاں نہیں پکڑتے تھے۔ کہتے تھے یہ پیروں فقیروں کا دن ہے۔ اِس دن اللہ اللہ کرنا چاہیے۔ لیکن ایک دن وہ مجھے مسجد میں لے جانے کے بجائے گاؤں کے قریب بہنے والی ندی پر لے گئے۔ میری عمر اس وقت دس بارہ سال تھی۔ کہنے لگے "میں چاہتا ہوں تم بہت بڑے شکاری بنو"۔

"وہ تو میں بن رہا ہوں" میں نے کہا۔

"مجھے تو یقین نہیں آتا" وہ بولے۔

"آپ جس طرح کہتے ہیں، میں ویسے ہی کرتا ہوں" میں نے کہا۔

"لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارا دِل مچھلی کے شکار میں نہیں لگتا" وہ مایوس ہو کر کہنے لگے۔

"میں اب مچھلیوں کو پہچان لیتا ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ یہ رہُو ہے، یہ تھیلا ہے، یہ ملّی ہے، یہ سنگھاڑی ہے، یہ گروج ہے، یہ کینگڑ ہے، یہ بام ہے"۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر ان مچھلیوں کے نام گنوائے جو مجھے یاد تھے۔

وہ بولے "یہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارا دل جال کے بجائے غلیل میں اٹکا ہوا ہے"۔

"ہاں، یہ بات تو ہے۔ مجھے جال سے مچھلیاں پکڑنے کے بجائے غلیل سے پرندوں کا شکار کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے یا پھر میں خرگوش، گیدڑ، لومڑی اور ریچھ کا شکار پسند کرتا ہوں، گاؤں کے نمبردار چودھری اللہ دتّا کی طرح"

میں نے والد صاحب کو صاف صاف بتا دیا۔
اگلے دن میرے والد مجھے گاؤں کے نمبردار چودھری اللہ دتّا کے گھر چھوڑ آئے اور جب دس دن بعد اِنسپکٹر آیا اور اس نے مچھلی کا نیا لائسنس بنوانے کے لیے کہا تو ابّا جی نے اپنا نیا لائسنس بنوا لیا لیکن میرا لائسنس نہیں بنوایا۔
میں اب چودھری اللہ دتّا نمبردار کا نوکر تھا۔ میرا کام یہ تھا کہ میں ان کی بندوق صاف کروں اور کارتوسوں کا حساب رکھوں۔ ان کے پاس چار کُتّے تھے۔ ان کو نہلانا، انہیں سیر کے لیے لے جانا اور ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا بھی میری ڈیوٹی میں شامل تھا۔
جب چودھری صاحِب شکار کے لیے جاتے تو میں اُن کی بندوق اُٹھا کر ان کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے چلتا۔
یہ بہت مشکل کام تھا۔ میں تڑکے اٹھتا تھا اور آدھی رات کو سوتا تھا۔ سارا دن چودھری صاحِب کے کاموں میں مصروف رہتا۔ جس روز شکار پر جانا پڑتا تو بُرا حال ہو جاتا، کیوں کہ مجھے کُتّوں کے ساتھ بھاگنا پڑتا۔ شکاری کتّوں کے ساتھ بھاگ بھاگ کر میری دونوں ٹانگیں بھی کتّوں کی ٹانگوں کی طرح سخت اور پتلی ہو گئی تھیں۔
ایک دن چودھری صاحِب نے مجھے خاص طور پر حویلی میں بُلوایا اور پوچھا "جوان، تمہاری اِسپیڈ بنی یا نہیں؟"
"جی، میری اِسپیڈ بن گئی ہے، آپ کی دُعا سے" میں نے کہا۔
"شاباش! جوان، میں چاہتا ہوں کہ تمہاری رفتار لومڑی کو پکڑنے والے کالُو کی طرح ہو"۔
کالُو شکاری کتّے کا نام تھا اور اس نے سب سے پہلے لومڑی کا شکار کیا تھا۔ اِس لیے وہ لومڑی کو پکڑنے والا کالُو کہلاتا تھا۔
"میری اِسپیڈ تو کالُو سے بھی زیادہ ہے، چودھری جی" میں نے کہا۔
"ہی شاباش! تم ماہی گیر کے بیٹے ہو اور ماہی گیر بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ سختی اور مضبوطی تمہیں وِرثے میں ملی ہے"۔
پتا نہیں مضبوطی اور سختی مجھے وِرثے میں ملی تھی یا نہیں، البتّہ مجھ پر سختی بہت تھی۔ اِس سختی کے باوجود میرے والد خوش تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کا بیٹا شکاری بن رہا ہے کیوں کہ وہ ایک ایسے شکاری کے پاس ہے جو اس علاقے کا مشہور شکاری ہے۔
چودھری مجھے کتّوں کی خدمت کے ساتھ ساتھ کتّوں کے ساتھ دوڑاتے بھی تھے۔ یہ کام ایک مہینے تک ہوتا رہا۔ اگر مجھ سے ذرا سُستی ہو جاتی تو چودھری صاحِب طیش میں آجاتے اور میری خوب مرمّت کرتے۔ ایک دن انہوں نے غصّے میں آکر کالو کو مُجھ پر چھوڑ دیا، لیکن وہ وفادار نکلا۔ میں اسے کھانا کھلاتا تھا، اِس لیے وہ مجھے پہچانتا تھا۔ اس نے بھونک بھونک کر مجھے صرف ڈرایا دھمکایا، اپنے دانتوں کو مُجھ سے دور ہی رکھا۔
ایک سال کی ٹریننگ کے بعد چودھری صاحِب نے ایک بار پھر مجھے اپنی حویلی میں بُلوایا۔
"دیکھو جوان، تم دوڑ میں اب پکّے ہو گئے ہو۔ سب سے پہلے شکاری کو دوڑ میں پکّا ہونا چاہیے۔ ٹھیک ہے ناں؟" انہوں نے مُجھ سے کہا۔
"ہاں، ٹھیک ہے، چودھری جی" میں نے کہا۔
"اب تمہاری ٹریننگ ہو گی نشانے بازی کی۔ ٹھیک ہے؟" اُنہوں نے پُوچھا۔
"بِالکُل ٹھیک ہے" میں نے ادب سے جواب دیا۔
"میرے پاس دو بندوقیں ہیں۔ ایک تم لے لینا" چودھری صاحِب نے کہا۔
"بہت اچھا" میں بولا۔
چودھری اللہ دتّا نے ایک نوکر کو اشارہ کیا۔ وہ حویلی کے اندر گیا اور ایک بندوق اُٹھا لایا۔
"یہ بندوق اب تمہاری ہے۔ ہاں، اِس کا لائسنس

نہیں ہے۔ لائسنس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ دوسری بندوق کا لائسنس ہمارے پاس ہے۔ تم سے کوئی سرکاری آدمی کبھی پوچھے تو اس سے کہنا کہ یہ بندوق چودھری اللہ دِتّا نمبردار گھسان پور کی ہے۔ دنیا ہمیں جانتی ہے۔ اگر نہ بھی جانے تو بھی کیا ہوا؟۔ علاقے کا تھانیدار تو ہمیں جانتا ہے۔ ابھی کل ہم نے سولہ سیر دیسی گھی کا ٹین اسے بھیجا ہے"۔

چودھری صاحب کا نہ بیٹا تھا نہ بیٹی۔ زمین بہت تھی اس لیے آمدنی بھی کافی تھی۔ ان کا اگر کوئی شوق تھا تو بس شکار۔ دور دور سے شکاری ان کے پاس آتے تھے اور ان کی حویلی میں عیش کرتے تھے۔ کتّے بھی آتے تھے لیکن ان کے لیے حویلی سے ہٹ کر ڈیرا بنا ہُوا تھا جس کو کتّوں کا ڈیرا کہا جاتا تھا۔

سال بھر میرا نشانہ پکّا ہوتا رہا۔ چودھری صاحب میرے والد کو ہر مہینے میری تنخواہ دیا کرتے تھے۔ کتنی؟ یہ مجھے آج تک پتا نہ چل سکا۔ نہ چودھری جی نے مجھے بتایا اور نہ اباجی نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ وہ دونوں خوش تھے۔ والد اس لیے کہ میں شکاری بن رہا تھا اور شکاری بھی شیر اور چیتے کا اور چودھری صاحب اس لیے خوش تھے کہ انہیں ایک ایسا ہونہار شاگرد ملا تھا جو ان کی ہر بات بلا چُون و چرا مانتا ہے۔

ہمارا گاؤں ضلع ڈوڈہ کی تحصیل کشتواڑ میں تھا۔ ڈوڈہ کا علاقہ اب کشمیری حُریّت پسندوں کی وجہ سے خاصا مشہور ہو گیا ہے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں، اُس وقت ہمارا علاقہ کشتواڑ کا حصّہ تھا، کیوں کہ میں 1947 سے پہلے کی بات کر رہا ہوں، جب پاکستان اور بھارت آزاد نہیں ہوئے تھے۔ اب ڈوڈہ کا ضلع جموّں میں ہے اور وہاں بھارتی فوج اور کشمیری مجاہدین میں جنگ کی خبریں آتی رہتی ہیں۔

ہم صبح سویرے ترائی کے علاقے میں نکل جاتے اور شکار کی تلاش شروع ہو جاتی۔ ہندو، مسلمان اور سکھ شکاری اپنی اپنی ٹولیوں کے ساتھ شکار کھیلتے۔ ان ٹولیوں میں ایک طرح کا مقابلہ ہوتا۔ چودھری صاحب کا خیال تھا کہ میں ان کی ٹولی کا سب سے اچھّا نشانے باز ہوں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں نے ایک دن ایک شیر کو شکار کیا تھا لیکن مشہور یہ ہوا کہ نشانہ چودھری نے لگایا تھا۔ جب ہندو اور سکھ شکاریوں نے مجھ سے معلوم کیا تو میں نے یہی کہا کہ اس شیر کو چودھری جی نے مارا تھا۔ چودھری کی عزّت میں جو دن دوگنی رات چوگنی ترقّی ہوئی اور ان کی خوشی میں جو ہزاروں من اضافہ ہوا، اُس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔

ایک دن میں والد صاحب سے ملنے کے لیے گھر گیا ہوا تھا کہ چودھری کا نوکر مجھے بُلانے آیا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ نوکر میرے پیچھے میرے گھر مجھے بُلانے آئے۔ میں نے نوکر سے پوچھا تو اس نے کہا کہ کسی ملک کا کوئی شہزادہ آیا ہے، اس لیئے چودھری نے آپ کو بُلوایا ہے۔

میں جب چودھری کی حویلی میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک ساڑھے پانچ فٹ کا نوجوان چودھری کے پاس بیٹھا ہے اور چودھری خود بڑے آرام سے پلنگ پر بیٹھے ہیں۔

مجھے دیکھ کر چودھری جی نے کہا "دلاور، یہ نیپال کے شہزادے سنگرام بہادُر صاحب ہیں۔ ان سے ملو"۔

میں جُھک کر آگے بڑھا اور مُصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ شہزادہ سنگرام بہادُر نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے جُھک کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا، اسے چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ شہزادہ بہت خوش ہوا لیکن اس سے زیادہ چودھری صاحب خوش ہوئے۔

"یہ میرا شاگرد ہے۔ دلاور علی اِس کا نام ہے۔ بہُت بڑا شکاری ہے۔ کئی شیر شکار کر چکا ہے" چودھری جی نے میرا تعارُف کرایا۔

"ہاں، ہم نے دلاور کی شہرت سُنی ہے۔ بہُت بڑا شکاری ہے" شہزادے نے کہا۔

"اللہ کا کرم ہے اِس پر" چودھری نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آخر شاگرد کس کا ہے، چودھری اللہ دتّا نمبردار آف

گھسان پور کا جو خود شہرت یافتہ شکاری ہے۔"

چودھری صاحب چاہتے تھے کہ شہزادہ اُن کے ہاں رات کو رہے لیکن شہزادہ جلدی میں تھا۔ اُسے اُسی روز جموں پہنچنا تھا اور وہاں رات گزار کر اگلے دن کھٹمنڈو روانہ ہونا تھا۔ کھٹ منڈو شہر نیپال کا دارُالسلطنت ہے۔ شہزادہ سیرو شکار کے لیے جموں آیا تھا اور جب اُسے بتایا گیا کہ گھسان پور کے نمبردار نے شیر کا شکار کیا ہے تو وہ چودھری اللہ دتّا سے ملنے کے لیے آیا۔ نیپال میں شیر کے شکاری کو دیوتا خیال کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ نیپال کے لوگوں کا خیال ہے کہ شیر کے اندر بھی دیوتا کی رُوح ہوتی ہے اور اِس روح کو صرف بڑا دیوتا ہی فنا کر سکتا ہے۔

شہزادے کو گئے ہوئے ایک مہینا ہُوا تھا کہ نیپال سے چودھری جی کے نام رائل گیم سوسائٹی کا دعوت نامہ آیا، جس پر شہزادہ سنگرام بہادُر کے دستخط تھے۔ اس میں لکھا تھا کہ چودھری صاحب کھٹمنڈو تشریف لائیں۔ مئی میں شاہی شکار گاہ میں شیر کا شکار کھیلا جائے گا، جس میں دنیا بھر کے شکاری شریک ہوں گے۔ کھانے پینے اور آنے جانے کا تمام خرچ حکومتِ نیپال کے ذمّے ہو گا۔ ایک مُلازم ساتھ لایا جا سکتا ہے۔ شکار ہاتھیوں پر بیٹھ کر کیا جائے گا لیکن ہاتھی کے بغیر بھی شکار کرنے کی اِجازت ہو گی۔

جب ہم کھٹمنڈو پہنچے تو شہزادہ سنگرام بہادُر ہوائی اڈے پر ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ ہمیں کار میں بٹھا کر شاہی مہمان خانے پہنچا دیا گیا۔ دوسرے دن ہم نے شاہی شکار گاہ کی سیر کی۔ اسے رائل پارک کا نام دیا گیا تھا اور یہ پارک کوہِ ہمالیہ کے دامن میں ترائی کی پہاڑیوں میں تھا۔ اس کا رقبہ ایک لاکھ بیس ہزار ایکڑ تھا اور اس میں خرگوش سے لے کر شیر تک ہر قسم کا شکار ملتا تھا۔ ہم نے شکار گاہ ہیلی کاپٹر میں دیکھی تھی، اِس لیے مزہ نہ آیا کیوں کہ اُوپر سے درختوں کے پتّے، پتھر اور جھاڑیاں ہی نظر آئیں۔ شاخوں، پتّوں اور جھاڑیوں کے پیچھے کیا کچھ تھا، اس کا پتا نہ چلا۔

شاہی مہمان خانے میں آکر چودھری نے کہا۔ "میں نے

پہلی بار ہیلی کاپٹر کی سواری کی ہے"۔

"میں نے بھی، چودھری جی" میں نے کہا۔ ویسے اُسے اِس بات کا عِلم تھا۔

"شاہی مہمان خانہ بہُت بڑا ہے۔ واقعی شاہی مہمان خانہ ہے"۔

"بادشاہوں کے کام بڑے ہی ہوتے ہیں جی" میں نے کہا۔

"ابھی شکار میں کچھ دن ہیں۔ اگر ہاتھی یا اُونٹ مل جائے تو اس پر سوار ہو کر رائل پارک کی سیر کی جائے" چودھری نے کہا۔

"میں پتا کرتا ہوں۔ ہاتھی شاید مل جائے۔ اونٹ نیپال میں نہیں ہوتے" میں بولا۔

میں نے شاہی فیل خانے کے ایک افسر سے بات کی اور دوسرے دن ہاتھی کا انتظام ہو گیا۔ افسر نے کہا تھا کہ جیپ کا انتظام بھی ہو سکتا ہے لیکن چودھری صاحب ہاتھی کی سواری کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ ہاتھی نہ تھا، ہتھنی تھی، کالی اور صحّت مند۔ اُس کی گردن پر مہاوت بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے چودھری اور چودھری کے پیچھے میں۔ ہم صبح روانہ ہوئے تھے اور دوپہر سے پہلے جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔

مہاوت اپنا اور ہمارا کھانا ساتھ لے کر آیا تھا۔ جب بھوک لگی تو ہم نے ایک چھوٹی سی آب شار کے پاس بیٹھ کر کھانا کھایا اور پھر آگے چل پڑے۔

اب دوپہر ہو گئی تھی اور ہم اس وقت گھنے جنگل کے اندر تھے۔ اب طے ہوا کہ واپس چلیں کیوں کہ ہتھنی بھوکی تھی اور اس کے لیے چارے کا انتظام نہ تھا۔ چودھری جی کو ہتھنی پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو کچھ دُور بڑ کا درخت نظر آیا۔ انہوں نے مہاوت سے کہا کہ وہ ہتھنی کو بیٹھنے کا حکم دے۔ مہاوت نے ہتھنی کو بٹھایا تو چودھری صاحب یہ کہتے ہوئے نیچے اُتر گئے کہ وہ بڑ کے درخت سے پتّے توڑ کر لاتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ جنگل میں گُم ہو گئے۔

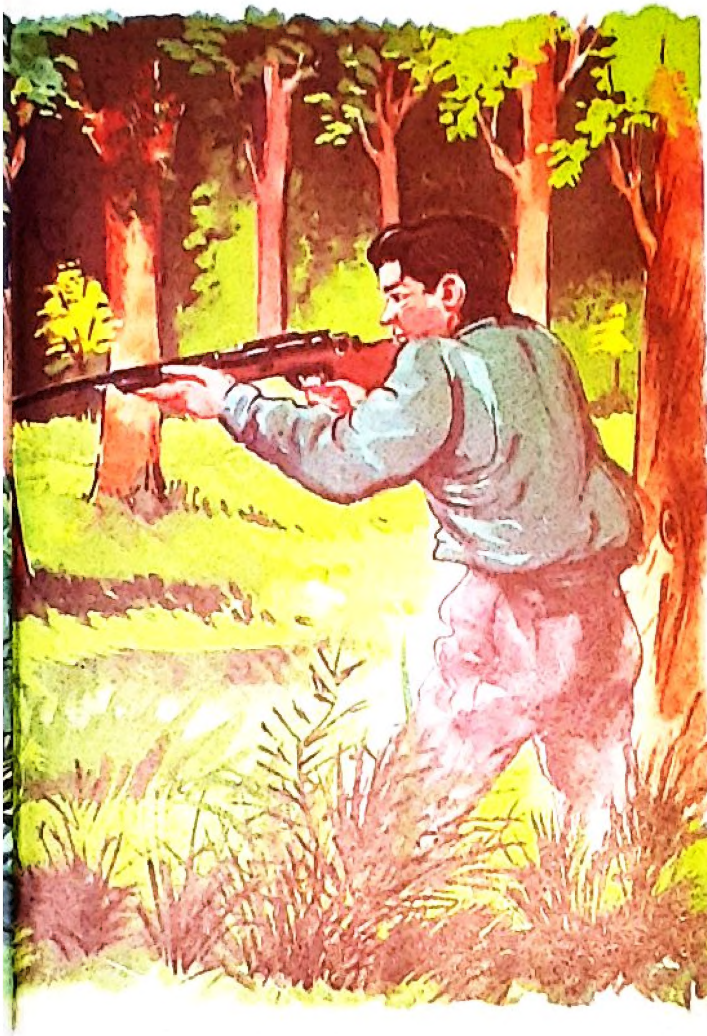

ہم نے تھوڑی دور جا کر ہتھنی کو کیکر کے ایک درخت کے ساتھ باندھا۔ وہ جلدی جلدی آنکھیں جھپک رہی تھی اور کچھ سونگھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ دراصل وہ کچھ بے چین سی تھی۔ جنگل میں ہر طرف خاموشی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے پرندے چہچہا رہے تھے لیکن اب وہ بھی خاموش تھے۔ جس طرح طوفان سے پہلے خاموشی چھا جاتی ہے، کچھ ایسی ہی حالت تھی۔

چودھری اللہ دتّا بڑ کے درخت پر چڑھے اور پتّے توڑ توڑ کر نیچے گرانے لگے۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ کافی پتّے اکٹھے ہو گئے ہیں تو وہ نیچے اُترنے لگے۔ ابھی وہ زمین سے کچھ اُوپر ہی تھے کہ ان کی نظر ایک شیر پر پڑی جو درخت کے نیچے کھڑا ان کی طرف دیکھ دیکھ کر دُم ہلا رہا تھا۔ چودھری جی کے اوسان خطا ہو گئے۔ انہوں نے گھبرا کر اوپر چڑھنے کی کوشش کی تو پاؤں پھسل گیا اور وہ دھڑام سے نیچے گر پڑے۔

جس جگہ چودھری جی گرے تھے، اُس جگہ شیر کھڑا تھا۔ چودھری جی اُسی کے اُوپر گرے تھے۔ وہ پہلے تو گھبرا کر بھاگا لیکن جب چودھری کو دیکھا تو غصّے سے ایک دم پلٹا اور ان پر حملہ کر دیا۔ چودھری نے اپنا دایاں ہاتھ تیزی سے آگے بڑھایا اور شیر کے کُھلے مُنہ کے اندر ڈال کر اس کی زبان پکڑ لی۔ لمحہ بھر کے لیے شیر ہکّا بکّا رہ گیا۔ اس کے بعد اس کے دانتوں کے خنجر ایک دوسرے کے قریب آئے اور انھوں نے چودھری کی ہتھیلی کو چیر ڈالا۔ چودھری چیخ اُٹھا اور اس نے اپنا بائیں ہاتھ کا گھونسا شیر کی دائیں آنکھ پر زور سے مارا۔

چودھری کی چیخ میں نے سُنی تو میں بندوق لے کر اس طرف بھاگا۔ جب میں اس جگہ پہنچا تو دیکھا کہ چودھری جی شیر کی آنکھ پر گھونسے مار رہے ہیں۔

میں نے پیچھے سے شیر پر اس طرح گولی چلائی کہ وہ چودھری کے نہ لگے۔ دوسری گولی کھا کر وہ ایک طرف لُڑھک گیا اور میں ادھ موئے چودھری کو اٹھا کر ہتھنی کی طرف چل دیا۔ میں نے مہاوت کی مدد سے چودھری کو ہتھنی پر ڈالا اور شاہی ہسپتال پہنچایا۔ شیر کی لاش شہزادے کو بھجوادی۔

چودھری صاحب دو ماہ ہسپتال میں رہے۔ اِس دوران میں وہ تمام شکاری انہیں دیکھنے آئے جو شہزادے کی دعوت پر کھٹمنڈو آئے تھے۔ میں نے شکار کے دس دن چودھری کے پاس بیٹھ کر گزارے اور شکار میں حصّہ نہ لیا۔ لیکن اس مقابلے میں اوّل آنے والا شکاری میں ہی تھا۔ وہ اِس لیے کہ میں نے ایک شکاری کی جان اپنی جان خطرے میں ڈال کر بچائی تھی۔

مجھے 1945ء کا بہترین شکاری قرار دیا گیا اور جب 1950ء میں لندن میں شکاریوں کی عالمی کانفرنس ہوئی تو اُس میں شرکت کے لیے مجھے بھی بُلوایا گیا، جو میرے اور میرے وطن، پاکستان کے لیے بہت بڑا اِعزاز تھا۔

مُجرم کون؟

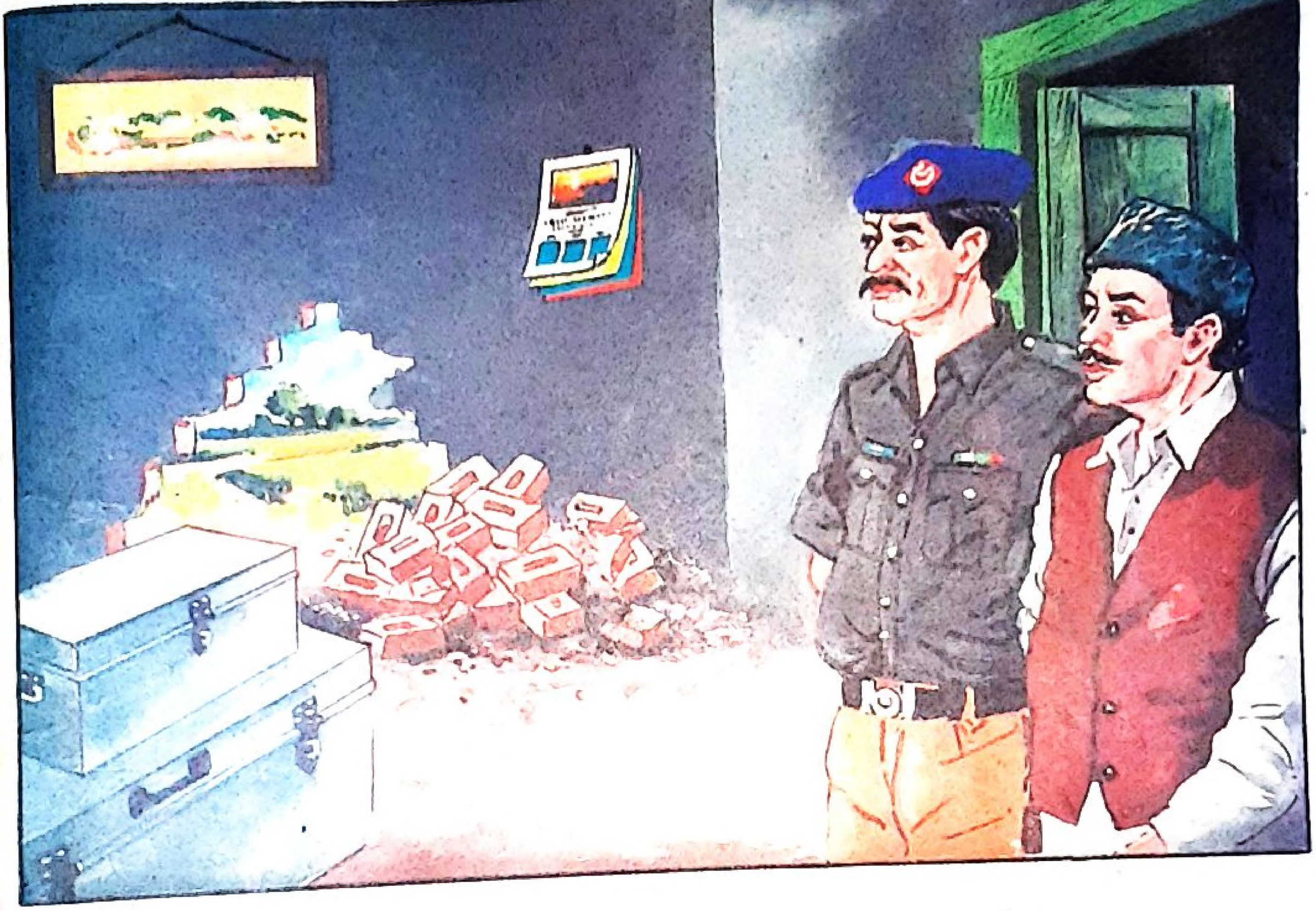

چودھری نثار احمد کے گھر میں رات کو چور نے نقب لگائی۔ وہ اُن کے کمرے کی دیوار توڑ کر اندر گھُسنا چاہتا تھا کہ چودھری صاحِب کی آنکھ کھُل گئی، اور اُن کے شور مچانے پر چور بھاگ گیا۔

چودھری صاحِب نے پولیس کو بتایا "مجھے اپنے پڑوسی پر شُبہ ہے۔ پچھلے دِنوں میرا اُس سے جھگڑا ہوگیا تھا، اور اُس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں اِس محلّے میں تمھیں چین سے نہیں رہنے دوں گا۔ اُس کا صحن میرے کمرے کی دیوار سے مِلتا ہے۔ یہ یقیناً اُسی کی کارستانی ہے"۔

پولیس اِنسپکٹر نے چودھری صاحِب کے پڑوسی کے صحن میں جاکر دیوار کا مُعاینہ کیا۔ پھر وہ چودھری صاحب کے گھر آیا اور ٹوٹی ہوئی دیوار دیکھ کر بولا "چودھری صاحِب، آپ نے اپنے پڑوسی کو پھانسنے کے لِیے جو جال لگایا تھا، افسوس ہے کہ آپ اُس میں خود ہی پھنس گئے۔ میں آپ کو ایک بے گناہ شخص پر جھوٹا اِلزام لگانے کے جُرم میں گرفتار کرتا ہوں"۔

بتایئے، اِنسپکٹر نے یہ کیسے جانا کہ چودھری صاحِب کے کمرے میں نقب اُن کے پڑوسی نے نہیں، خود اُنھوں ہی نے لگائی تھی؟ صحیح جواب دینے والے ساتھی کو 500 روپے کی کتابیں دی جائیں گی۔ جواب کے ساتھ کوپن ضرور پُر کر کے بھیجیے۔ (صفحہ 55 اور 56 دیکھیے)۔

4700 The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 12.00

FEROZSONS PRIMARY SCIENCE

FEROZSONS EDUCATIONAL

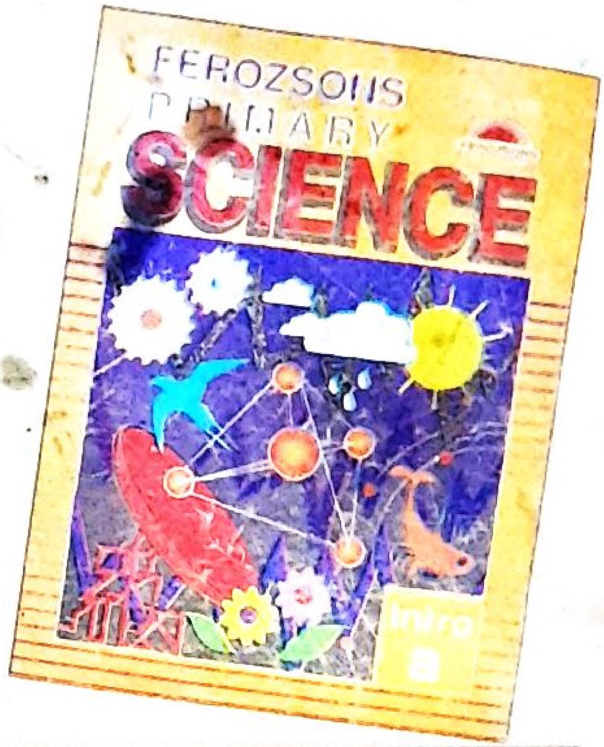

FEROZSONS PRIMARY SCIENCE is a complete series of twelve systematically graded books, well suited to the educational needs of children in English Medium Schools worldwide.
The aim of this series is to present the fundamentals of science in a way which children can easily understand and assimilate. They will not only remember the facts but also remember that the learning of them was a joyful experience.
Each book is divided into a number of parts which cover the main areas of study and are colour-coded for easy reference.
All the books are richly illustrated in colour and each drawing has been specially chosen to complement and support the text.
Each book commences with an interest-stimulating quiz and ends with an extra-curricular exercise entitled 'Do You Know?'

Intro a — 969 0 10141 2, Rs. 35.00
- Part 1 Human beings
- Part 2 Healthcare and safety
- Part 3 Living and non-living things
- Part 4 Animals
- Part 5 Objects

1a — 969 0 10092 0, Rs. 40.00
- Part 1 Human beings
- Part 2 Things around us
- Part 3 Living and non-living things
- Part 4 Animals
- Part 5 Animals and their babies

2a — 969 0 10094 7, Rs. 40.00
- Part 1 Human beings
- Part 2 Health and safety
- Part 3 Animals
- Part 4 More about animals
- Part 5 Sound
- Part 6 Magnetism

Intro b — 969 0 10142 0, Rs. 35.00
- Part 1 Plants
- Part 2 Food
- Part 3 Light and Heat
- Part 4 Movement
- Part 5 Distance
- Part 6 Earth and Sky
- Part 7 Time

1b — 969 0 10093 9, Rs. 40.00
- Part 1 Objects
- Part 2 Plants
- Part 3 Force and machines
- Part 4 Energy
- Part 5 Sound
- Part 6 Magnetism
- Part 7 Heat and temperature
- Part 8 Light and shadow
- Part 9 Time

2b — 969 0 10095 5, Rs. 40.00
- Part 1 Colours
- Part 2 Plants
- Part 3 Force and machines
- Part 4 Energy
- Part 5 Electricity
- Part 6 Material and matter
- Part 7 Time

3a — 969 0 10096 3, Rs. 45.00
- Part 1 Human beings
- Part 2 Healthcare and safety
- Part 3 Animals
- Part 4 Sound
- Part 5 Magnetism
- Part 6 More about animals

4a — 969 0 10098 X, Rs. 40.00
- Part 1 Human beings
- Part 2 Healthcare and safety
- Part 3 Living things and their needs
- Part 4 Living things protect themselves
- Part 5 Sound
- Part 6 Magnetism

5a — 969 0 10100 5, Rs. 50.00
- Part 1 Human beings
- Part 2 Healthcare and safety
- Part 3 Animals
- Part 4 Sound

3b — 969 0 10097 1
- Part 1 Light and colour
- Part 2 Plants
- Part 3 Heat energy
- Part 4 Light energy
- Part 5 Force and energy
- Part 6 Materials and matter
- Part 7 Earth and atmosphere
- Part 8 Time

4b — 969 0 10099 8, Rs. 40.00
- Part 1 Colours
- Part 2 Plants
- Part 3 Heat and temperature
- Part 4 Electricity
- Part 5 Time

5b — 969 0 10101 3, Rs. 50.00
- Part 1 Plants
- Part 2 Animals
- Part 3 Force and motion
- Part 4 Heat and electricity
- Part 5 Matter
- Part 6 Earth and atmosphere
- Part 7 Time

(Prices are subject to change without notice)

Also under publication: Available in 1994

Ferozsons Primary English
Ferozsons Primary Mathematics
Ferozsons Primary Atlas.

FEROZSONS (Pvt) LTD.

LAHORE RAWALPINDI KARACHI

Lahore: 60, Shahrah-e-Quaid-e-Azam, Phones: 6301196–98 Fax: 627881
Rawalpindi: 277, Peshawar Road, Rawalpindi, Phone: 563503 Fax: 56427
Karachi: 1st Floor, Mehran Heights, Main Clifton Road, Karachi
Phones: 570527-570534-537730 Fax: 570534